کلچر کا مسئلہ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

Marfat.com

کلچر کا مسئلہ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Marfat.com

297.197 Abdullah, Dr. Syed
Kulchar Ka Mas'ala / Dr. Syed Abdullah.- Lahore : Sang - e - Meel Publications, 2001.
144p.
1. Islam - Kulchar.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2001ء

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1193-X

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

فہرست مضامین

پہلا باب	کلچر کیا ہے؟ مغربی حکما کی تعبیرات	10
دوسرا باب	مسلم حکما کے تصورات (کلچر کے بارے میں)	20
تیسرا باب	اسلامی کلچر کی ماہیّت	33
چوتھا باب	مسلمانوں کے فنون لطیفہ	42
پانچواں باب	مسلم کلچر میں خوش دلی کی لہر	45
چھٹا باب	اسلامی ہندی کلچر	57
ساتواں باب	اثرات فرنگ کا دور	71
آٹھواں باب	تحریک پاکستان کے ثقافتی محرکات	75
نواں باب	پاکستانی دور	83
دسواں باب	پاکستانی کلچر (جدید رجحانات)	87
گیارہواں باب	پاکستانی کلچر پر جدید ترین مغربی میلانات کا اثر	94
بارہواں باب	اسلامی کلچر سے متعلق کتابوں کے بارے میں	98
تیرہواں باب	پاکستانی کلچر (ایک سوال اور اس کا جواب)	107
ضمیمہ الف	مسلم کلچر میں فنون لطیفہ۔ تعیش یا عبادت؟	122
ضمیمہ ب	پاکستان...... اسلامی زندگی کی تجربہ گاہ؟	133

Marfat.com

کتاب کے ابواب اور مطالب کا خلاصہ

میرے اس کتابچے میں سب سے پہلے کلچر کی گوناگوں تعریفیں آرہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر مغربی حکما کی پیش کی ہوئی ہیں۔

دوسرے باب میں مسلمان حکما کے خیالات پیش کررہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے کلچر یا ثقافت جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے اس لیے کلچر کے مختلف موجودہ مفہوم میں نے سامنے رکھ کر ان سے ملتے جلتے خیالات کو جمع کردیا ہے۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ تہذیبِ نفس مسلمانوں کے ادب کا قدیم اور خاص لفظ ہے لہٰذا اس سے ربط دے کر ادب و آداب و اخلاق جیسے تصورات کی تشریح کی کوشش کی ہے۔

تیسرے باب میں اسلامی کلچر کی ماہیت کی بحث ہے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مغرب والے جس شے کو اسلامی کلچر کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ نیز یہ بھی کہ مغربی تصوّر کی رُو سے جو سرگرمیاں مسلمانوں کے عہد تاریخی میں ظہور میں آئیں ان کی قدروقیمت کیا ہے؟ چوتھے باب میں اسلامی (مسلم) ہندی کلچر (مظاہر حیات و ذوقیات) کی تفصیل (بالاجمال) ہے۔ پانچویں، چھٹے، ساتویں، آٹھویں باب کا تعلق پاکستان کے کلچر سے ہے۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کلچر کے مؤثر عناصر میں چونکہ عقیدہ بھی ہے اس لیے ایک مسلم مملکت میں یہ جاننا لازمی ہوگا کہ موجودہ پاکستانی کلچر کی روح کن عقیدوں سے متاثر ہے؟ ہندی اصنامی سے یا فرنگی سے یا اسلامی سے؟ آخر میں یہ خلاصہ نکالا ہے کہ پاکستان ابھی کسی بامعنی کلچر کی تلاش میں ہے جو اس کے لیے انفرادیت کا باعث ہو۔

Marfat.com

مقدمہ

کلچر کا مقبول ترین اردو (عربی) ترجمہ ثقافت ہے' اس کے علاوہ کبھی کبھی' اس کے لیے لفظ تہذیب اور بے خیالی میں تمدن کا لفظ بھی استعمال ہو جاتا ہے مگر میں نے اس کتاب میں کلچر کی اصطلاح اختیار کر لی ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی متبادل ترجمہ شدہ اصطلاحات سے اجتناب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی' فارسی اور اردو میں جو متبادل اصطلاحات آج کل مروج ہیں وہ سب کی سب' ترجمے کی مجبوری کی پیداوار ہیں اور حقیقی مفہوم کے محض اشارے ہیں۔ اور اگرچہ خود لفظ کلچر میں طرح طرح کے ابہامات ہیں مگر ترجموں میں ابہامات اور بھی بڑھ گئے ہیں' بنابریں میں نے اصل لفظ ہی اختیار کر لینا مناسب خیال کیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں متبادل الفاظ ثقافت' تہذیب اور تمدن بھی مجبوراً آ گئے ہیں۔

اب سب سے پہلے مذکورہ متبادلات کی تشریح مفید رہے گی۔

ثقافت

یہ کلچر کا سب سے معروف و مروج اردو متبادل ہے۔ عربی کا یہ لفظ ث ق ف مادّے سے ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں = پالینا' سیدھا کرنا وغیرہ۔ کلاسیکل عربی ادب میں ثقافت کا لفظ موجودہ (کلچر کے) معنی میں شاذ ہی استعمال ہوا ہے۔ غالباً بیسویں صدی کے نصف اول میں پہلی مرتبہ عرب ممالک میں کلچر کے معنوں میں استعمال ہو کر عام ہوا۔ ایران میں اس کی جگہ عموماً شائستگی کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ فارسی لفظ اردو میں ہے لیکن اردو میں لفظ ثقافت آ گیا ہے۔ اور اب کئی مبہم معنوں میں بلا تکلف استعمال ہو رہا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کا استعمال کم سے کم کروں الّابمجبوری زیادہ ضرورت ہوئی تو میں اس کی جگہ تہذیب و تمدن (شائستگی) کی اصطلاح لاؤں گا ورنہ کلچر ہی رہے گا۔ بدقسمتی سے اردو میں ثقافت اور کلچر دونوں کا مفہوم بالکل محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اکثر لوگ اسے محض ناچنے گانے کے معنوں میں لے رہے ہیں یا پھر اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ موہوم باتیں بھی اس میں شامل کر لی جاتی ہیں۔

Marfat.com

تہذیب

کلچر کے معنوں میں اس سے مراد ہیں انفرادی واجتماعی' ذوقی واخلاقی اور معاشرتی رویئے اور اجتماعی عادات' وسیع تر معنوں میں اس میں فنون بھی شامل ہوں گے اور علوم بھی اور آداب واخلاق بھی' لیکن قانون اور ارادت وتنظیمات کو اس میں علی العموم شامل نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ تمدن میں آتے ہیں۔ معنوی لحاظ سے شاید لفظ تہذیب ہی کلچر کا قریبی مترادف ہے۔ تہذیب کسی تمدن کے آزادانہ نشوونما پانے والے حصے یا رخ کو کہتے ہیں اور تمدن (Civilization) میں اس کے علاوہ شعبے بھی شامل ہیں جن کی تنظیم کے لیے آئین و قانون کا استعمال کیا جاتا ہے اور وہ معیّن منصوبہ بندی کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ تمدن (مدنیت) مکمل شہری زندگی کا کمال ہے۔ اس میں شہروں کی مرکب زندگی بنیادی چیز ہے۔ اور یہ انگریزی کے لفظ سولزیشن کا مترادف ہے اور تہذیب کے مقابلے میں وسیع تر لفظ ہے' لیکن بعض لوگوں کی رائے میں صورت برعکس ہے' یعنی تہذیب وسیع ہے اور تمدن محدود۔

بہر حال ثقافت کہیے یا کلچر۔ اس کتاب میں کلچر ہی مدِنظر ہے۔ یعنی ہمارے مدِنظر تہذیب ہی ہوگی ضرور تا اگرچہ بعض اوقات تمدن بھی شامل ہو جائے گا۔ (مثلاً اسلامی کلچر کی بحث میں) لیکن موجودہ مقالہ نگار کی غایت تہذیب یعنی کلچر ہی کی تشریح ہے۔

کلچر کے سلسلے میں بے شمار سوالات ہیں[1]۔ مگر اس کتاب میں سب کے جواب مشکل ہیں اور شاید اس کتاب کی ضرورت سے خارج بھی ہیں۔ تاہم ان سوالوں کی ایک فہرست پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سلسلے میں چند اصولی سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں جن کے معاملے میں بڑی اُلجھنیں ہیں۔ اس ضمن میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلچر (تہذیب) سے ہماری مراد کیا ہے۔ کیا یہ کسی منظم مسلکِ عمل کا نام ہے یا محض من کی موج یا محض فکر یا معین انداز حیات یا ان سب کا مجموعہ ہے۔ اس کا تعلق فرد کے اعمال وعادات سے ہے یا یہ اس اجتماعی یک رنگی اور سماجی تنظیم کا نام ہے جسے نقوش وحدت قومی بھی کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس کے نفوذ کے سرچشمے داخلی ہیں یا خارجی یا ایسے کہ باطن میں پوشیدہ رہ کر خارجی کوائف زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں' یہ بھی واضح نہیں کہ کلچر جن لطیف مظاہر یا مشاعر سے متعلق ہے ان کی مخصوص شکل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلچر' تمدن' تہذیب' ثقافت سولزیشن جیسے الفاظ جیسا کہ بیان ہوا جزوی ترادف کے باوجود مترادف نہیں' پھر کیا ہماری موجودہ اصطلاح کلچر (تہذیب یا ثقافت) بھی کوئی اسی طرح کی

Marfat.com

ناقابلِ تعریف چیز ہے؟ اسی طرح کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کلچر کیا ہے کیا یہ دین اسلامی کا دوسرا نام ہے؟ یا دین سے الگ کوئی مظاہرہ عمل یا مسلک ہے؟ یا اس سے زیادہ کوئی مجموعہ آثار و خصائل ہے؟ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر دین اور کلچر (ثقافت) کم وبیش مترادف ہیں تو دین (Way of Life) کی متعارف اور پسندیدہ تر اصطلاح کو ترک کرنے میں کونسی خاص مصلحت ہے۔ اور اگر دونوں میں کوئی تناقض ہے تو دین سے تعارض کے اس میں کون کون سے پہلو ہیں؟

ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "اسلامک کلچر" اور "ہندو کلچر" کے نعروں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوئے۔ اس وقت اس چیلنج کا علامہ اقبال سمیت کئی لوگوں نے جواب دیا تھا۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہندو کلچر کی کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو اسلامک کلچر بہر حال ایک زندہ حقیقت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت یہ بحث اس وجہ سے تشنہ سی رہی کہ اس میں سیاست دخیل تھی۔ معترض نے اعتراض سیاسی وجوہ سے کیا تھا اس لیے اس کو اس کا سیاسی اور الزامی جواب مل گیا، مگر اب جبکہ اس بحث میں کوئی پنڈت یا کوئی برہمن دخیل نہیں تو یہ بحث پھر اٹھائی جا سکتی ہے۔ اور یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم جس کلچر کے مدعی یا مبلغ ہیں آخر اس کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ صرف عقیدہ اور زاویۂ نظر ہے یا کوئی عمل بھی ہے؟ اور اگر یہ کوئی عمل ہے تو زمانی اور مکانی تسلسل نے اس کو حیات اجتماعی کی کن کن روایات سے مربوط کر رکھا ہے۔ اور اگر یہ روایات آج بھی زندہ ہیں یا زندہ رہنے کے قابل ہیں تو ان کا حضور سرور کائناتؐ اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی سے بھی کچھ رابطہ ہے یا نہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا کلچر کا کچھ تعلق عقیدوں سے بھی ہوتا ہے یا نہیں، یہ افراد یا کسی سوسائٹی کا بے قید آزاد عمل ہے یا اسے مقید رکھنے والے کچھ عناصر بھی ہوتے ہیں؟ غرض اس قسم کے گوناگوں خیالات و شکوک خیل در خیل اور قطار اندر قطار سامنے آجاتے ہیں جن کا تشفی بخش جواب اذعان وایقان کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ جو لوگ زمانے کے ساتھ نہیں چلتے زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ثقافت اسلام کسی ابدی صداقت کا نام ہے تو اس کو زمانے کے تغیرات کے تابع نہیں سمجھا جا سکتا اور اگر یہ بدلتا ہوا عمرانی عمل ہے تو کیا خود اسلام کو عہد بہ عہد بدلنا نہیں چاہیے؟ پاکستان کے مخصوص اسلامی دعووں کے مدِنظر یہ سب سوال برمحل ہیں۔ بعض اہل فکر کا یہ خیال ہے کہ کلچر (ثقافت) کا عمل اور مقصد دین کی ان بنیادی قدروں کو واضح کرتا ہے جن پر سارا عالم متحد ہو سکے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ بنیادی

Marfat.com

قدریں یا یہ عالمگیر صداقتیں تو روز ازل سے واضح اور ظاہر ہیں ان پر سارا عالم آج تک کیوں متحد نہ ہوا۔ ان اہل فکر کی رائے میں اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ ان قدروں کو زندگی کے ''اصلی مسائل'' سے منقطع کر کے دیکھا جاتا رہا' لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو یہی ''زندگی کے مسائل'' عالم گیر اتحاد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔ پس اگر یہ سچ ہے تو کیا زندگی کے یہ اصلی مسائل عالمگیر صداقتوں کے راستے میں ہمیشہ کے لیے رکاوٹ نہ بنے رہیں گے؟ محض عالم گیر صداقتوں کی تشریح یا چند مجرد حقیقتوں کے اعلان سے تو زندگی کے ٹھوس مسائل نہ کبھی حل ہوئے ہیں نہ اب ہوں گے۔ یہ مفکرین کہتے ہیں کہ سارے عالم کے اتحاد کی عمارت کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے وسائل سب کے لیے یکساں طور پر مہیا ہوں تاکہ انسانوں کے قلوب میں وہ صفائی اور اعتماد پیدا ہو جس کے نہ ہونے سے خدا کی مخلوق طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہی ہیں' ان کے خیال میں آج کا سب سے بڑا سوال یہ ہے اور نیا زمانہ اور اس کے نئے تقاضے اس بات کا صاف مطالبہ کرتے ہیں کہ اصلاح و تہذیب کی مہم مادّہ سے شروع ہو کر تکمیل روحانی کی طرف بڑھتی جائے نہ کہ بالعکس۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ زاویۂ نظر درست ہے؟ مادہ اگرچہ سراپا زندگی ہے مگر زندگی کی راہ میں سنگ گراں بھی ہے۔ اس لیے سائل پوچھتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی ہمواری کا سامان کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ یہ ہمواری لازمی ہے' لیکن یہ سوال پھر بھی باقی ہے کہ کسی داخلی آمادگی کے بغیر جسے آپ عقلی یا روحانی کہہ ڈالیے' حیوانی جبلتوں والی یہ مخلوق' یعنی انسان اس ہمواری کے لیے تیار کیسے ہوگا؟ اصل مسئلہ تو آمادگی کا ہے انسانوں کو شریف حیوان بنانے کیلیے جبر کو تو دائمی نسخہ نہیں بنایا جاسکتا لہٰذا دائمی آمادگی کا کوئی نسخہ تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے یہ بحث اس لیے چھیڑی ہے کہ چونکہ ہر خارجی مسئلے کا ایک باطنی رُخ بھی ہوتا ہے اس لیے کلچر کی بحث میں یہ باطنی رخ بھی ضرور رُونمائی کرے گا۔ کلچر صرف مظاہرہ کا نام نہیں' بلکہ ان مظاہر کے عقب میں کارفرما باطنی محرکات بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ محرکات عقیدے بھی ہوسکتے ہیں (جیسا کہ راقم الحروف کا خیال ہے) اور افراد و اجتماع کی ذوقیات بھی ہوسکتی ہیں (جیسا کہ اشتراکی مفکرین کا خیال ہے) جن کی رائے میں یہ ذوقیات ہی روحانیات کا درجہ رکھتی ہیں)۔ بہر حال اس کتاب میں' میں نے کلچر کے مظاہر کو عقیدوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کلچر عقیدوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ محض انسان کی معاشی مجبوریوں اور ضرورتوں کی پیداوار نہیں۔ اگرچہ ان کا بھی کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ حجتہ الاسلام امام غزالیؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے ''تعجب ہے لوگ

Marfat.com

دشواریوں کے آسان علاج چھوڑ کر مشکل تدبیروں میں لگے رہتے ہیں۔ گھر کے چراغ سے آگ حاصل کرنے کی بجائے چقماق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ اس سے آگ سلگائیں۔" ہمارا ابھی کچھ ایسا ہی حال ہے کہ ہم زندگی کی تشکیل میں ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہتے ہیں جو بے حد ناقابلِ گرفت اور دشوار ہیں۔ کلچر کا مسئلہ بھی اسی وجہ سے ناقابلِ گرفت ہو گیا ہے۔ دراصل یہ سیدھا سا معاملہ ہے' کلچر کے آسان معنی ہیں۔ طرز زندگی جو کسی قانونی جبر کے بغیر' رضاکارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتی ہے اور حسن کی شان رکھتی ہے۔ جس سے زندگی زیادہ بامعنی اور پُر راحت بن جاتی ہے۔ یہ[2] کلچر ہے۔ یہ مظاہر جو کسی جبری و قانونی تنظیم یا منصوبہ بندی سے ابھرتے ہیں تمدن کہلائیں گے۔

میرے نزدیک کلچر یہی ہے اس میں فنون و تفریحات' آداب انفرادی و مجلسی اور ذوقیات کی دوسری شکلیں شامل ہیں جو جبری نہیں۔

اس خُلاصے کے باوجود کلچر کی بحث اتنی آسان نہیں لہٰذا میں نے اس کتابچے میں وسیع ترین مباحث کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بحثیں آپ کو آئندہ ابواب میں ملیں گی۔

حوالہ جات

1۔ کلچر سے متعلق بہت سے سوالات کا جواب ایس۔ ایم۔ جعفر کی انگریزی کتاب (Islamic Culture) میں دیئے گئے ہیں۔

2۔ اس سلسلے میں مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب "اساسیات اسلام" شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور ملاحظہ ہو۔

پہلا باب

کلچر کیا ہے؟

اب جبکہ ہم نے ثقافت وغیرہ کی اصطلاح کو ترک کر کے "کلچر" پر اتفاق کر لیا ہے، تو سب سے پہلے اس لفظ کی تعریف لازمی ہے۔

کلچر کی اصطلاح، دوسری اکثر مغربی اصطلاحوں کی طرح مبہم اور مختلف المعنی ہے جس کے مختلف ادوار تاریخ اور مختلف زبانوں اور ملکوں اور مختلف علوم میں جدا جدا مفہوم ہیں، یہ لفظ ایک سے زیادہ شعبہ ہائے علم میں خصوصی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً تاریخ میں علم الاجتماع (عمران = Sociology) میں، حیاتیات (Biology) میں اور بشریات (Anthropology) میں، اور ایک حد تک نفسیات میں اس موضوع پر طویل بحثیں آتی ہیں Concise Oxford Dictionary میں لکھا ہے کہ دراصل یہ لفظ Cultivation (کاشت) کے معنوں سے ہوتا ہوا تربیت اور نشوونما اور ترقی کے منظم عمل تک پہنچا اور یہ ترقی و تربیت صرف[1] انسان تک محدود نہیں بلکہ دیگر اشیاء، مثلاً نباتات، اور حیوانات بھی اس میں شامل ہیں۔

Any deliberate effort to develop the qaualities of some objects

معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے مغربی مصنف اسے زیادہ معیّن معنوں میں استعمال کرنے لگے تھے۔ ان کے خیال میں کلچر دل و دماغ، اور ذوق و فکر کی تربیت و تہذیب کا نام تھا۔

The state or result or training (or refinement) of the mind (or of thought or taste)

پھر بہت جلد اس کا اطلاق کسی "تعلیم یافتہ آدمی کے عملی اکتساب و تحصیل" پر ہونے لگا۔

Actual attainment of an educated person

Marfat.com

شائستہ اخلاق، خوش ذوقی، فنی استعداد اور کسب علوم جو تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں کلچر کہلائے۔ اسی طرح یہ بھی قابلِ غور ہے کہ پرانے زمانے میں یہ لفظ کبھی سولزیشن کا ہم معنی ہوا اور کبھی اس سے الگ معنی میں آتا رہا۔

یہ سب کلچر کے ابتدائی معنی ہیں، جن کا جدید علم Anthropology (بشریات) کی مخصوص اصطلاح سے کچھ زیادہ تعلق نہیں...... اور جب میتھیو آرنلڈ نے اپنی کتاب Culture and Anarachy لکھی تو اس میں بھی یہ بشریاتی مفہوم موجود نہ تھا۔ یہ کسی فرد کی داخلی تہذیب تک محدود تھا۔ سب سے پہلے Klemn اور ٹائلر Tylor نے اس کے وہ معنی متعین کیے جو علم بشریات میں اب عام میں Tylor نے اس میں وسعت پیدا کر کے کسی قوم (یا اجتماع) کی ساری مجلسی زندگی تک پھیلا دیا۔ رسم و رواج، فنون لطیفہ و مفیدہ حالت امن و جنگ میں نجی اور مجلسی زندگی، مذہب، علوم اور آرٹ...... سب اس میں شامل ہو گئے۔ ٹائلر کے بعد کلچر کے بشریاتی معنی عام ہو گئے اور اس کی بے شمار تعریفیں سامنے آئیں۔ ایک عام تعریف[2] یہ ہے: کلچر عبارت ہے (انفرادی و مجلسی) رویے سے، جس میں افکار، علم، عقائد اور اصولی اقدار وغیرہ حصہ لیتی ہیں۔

Modes of behaviour,--and also ideas, knowledge, beliefs, norms, values and other things.

ظاہر ہے کہ ان تعریفوں میں بہت کچھ شامل ہو گیا ہے لیکن سب میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ کلچر ایک طرح کا رویہ ہے جو خارجی بھی ہے اور داخلی بھی۔ اس رویے کے مظاہر کلچر کہلاتے ہیں۔ یہ سمٹ کر محض ذوقی مجلسی رویے ہو سکتے ہیں اور پھیل کر کسی قوم کی پوری تہذیبی تمدنی زندگی پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

کلچر سے متعلق کتابوں میں بہت سی تعریفیں اور بھی آئی ہیں چنانچہ Koreber اور Kluckholm نے 161 تعریفیں درج کی ہیں۔ اور بعض نے Material Culture کا ذکر کر کے اوزار، ہتھیار، آلات، صناعات اور بے شمار دوسری ایجادات کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔

فلپ[3] Bagby نے کلچر کی تعریف کو زیادہ معیّن کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلچر کسی اجتماع کے اکثر افراد کے ان متواتر اور عادی (داخلی اور خارجی) رویوں کا نام ہے جو اپنے منبع کے اعتبار سے موروثی نہیں ہوتے (یعنی نسل انسانی کی عام جبلت سے تعلق نہیں رکھتے) بلکہ کسی اجتماع نے اپنے خاص ماحول میں، خاص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت

Marfat.com

اپنے اندر پیدا کر لیے ہوتے ہیں اور ان میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ کلچر کم و بیش ایک اجتماعی عمل ہے یعنی ایسا عمل جس میں ایک اجتماع کے اکثر آدمی مشترک رویہ رکھتے ہیں اور اس رویے میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

(The Premitive Cultures: E.B Tylor دیکھیے)

کلچر کا سائنٹفک نظریہ

'ایک ماہر بشریات (Anthropology) مالنوسکی نے کلچر کی سائنسی تشریح کرتے ہوئے اس کی یہ تعریف کی ہے:

It is the integral whole, consisting of implements, and consumer's goods for the various social groupings, of human ideas and crafts, beliefs and cutoms.

ترجمہ: کلچر ایک مربوط اکائی ہے جس میں اوزار' ہتھیار' صارفین کی کل اشیائے صرف گروہوں کی مجلسی زندگی کی رہنمائی کے لیے دستورنامے' انسانی افکار' صناعات' عقائد اور رسوم و رواج سب شامل ہوتے ہیں۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ کلچر کا سارا سلسلہ ابتدائی قسم کے اجتماعات سے لے کر' انتہا درجے کے پیچیدہ اجتماعات تک اپنے اپنے انداز میں موجود رہتا ہے جو قدرے مادی' قدرے جذباتی اور قدرے روحانی ہوتا ہے اور ان سب کے امتزاج سے ایک کلچر وجود میں آتا ہے۔

مالنوسکی اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کلچر سب سے پہلے یک حیاتیاتی (Biological) معاملہ ہے۔ کیونکہ انسان اصلاً حیوان ہی ہیں۔ انہیں اپنے نظام جسمانی کو زندہ رکھنے کے لیے' جسمانی ماحول سے باہر ایک دوسرا ماحول (Environment) بنانا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کی مادی ضرورتیں پوری کر سکیں..... یہ نیا ماحول اجتماعی تعاون کا متقاضی ہوتا ہے اسی سے کلچر کی ابتدا ہوتی ہے۔ بنیادی ضرورتوں کے دباؤ سے تعاون کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو ماحول تیار ہوتا ہے وہ کلچر کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ اس تعاون کی کامیابی اور اس کے معمار کا انحصار اجتماع کی قابلیت اور اس کی قوت عمل پر ہوتا ہے۔ پھر یہی ضرورتیں اور ان کے لیے تعاون کی صورتیں کلچر کو ترقی دیتی رہتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بنیادی طور سے' کلچر ضرورتوں سے پیدا ہوتا ہے۔

کلچر کے ابتدائی مرحلے ہی میں' مشترکہ مساعی کے نتیجے میں' ایک "بہتر

Marfat.com

معیار زندگی" کا تصور ابھر آتا ہے۔ پھر اسی معیار زندگی کی خاطر' کچھ نئی ضرورتیں اور نئے تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کے زیر اثر' اشیا و اشخاص اور معاملات کے بارے میں نئے رویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح اجتماع کا ماحول روز بروز بدلتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ اسی کو کلچر کی ترقی کہا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ کلچر ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کسی اجتماع کی مشترکہ مساعی (تعاون) سے ابھرتا ہے۔

چونکہ ہر نسل از روئے جبلت اپنے اکتسابات کو دوسری نسل تک پہنچاتی ہے اس لیے کسی نہ کسی قسم کا سلسلۂ تعلیم و تربیت بھی ہر کلچر میں موجود رہتا ہے۔ اور چونکہ اس معاملے میں تعاون کی ضرورت بھی ظاہر ہے جس پر سارے نظام کی کامیابی کا دارومدار ہے اس لیے رفتہ رفتہ اس تعاون کے عقلی اصول مقرر ہو جاتے ہیں جن پر کچھ جبری...... اور کچھ خوشدلانہ رضاکارانہ عمل ہوتا ہے اس سے ایک نظام قواعد' یعنی قانون ابھر آتا ہے۔ خوش دلانہ نظام کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور جبری نظام کو قانون......' اس کے علاوہ ایک نیم قانونی ضابطہ اور بھی چل پڑتا ہے جسے رسم و رواج کہا جاتا ہے۔

غرض یہ سب کچھ زندہ رہنے (اور بہتر طور پر زندہ رہنے) کے لیے بنیادی ضرورتوں (کھانا' کپڑا' مکان اور حفاظت جسمانی...... وغیرہ) کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے پیشے' نظام' تعلیم اور نظام قانون اور نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جس میں مذہب بھی شامل ہے...... اس سے ترقی کر کے ادارات (Institutions) کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ ادارے مذکورہ بالا بنیادی ضرورتوں کو عمدہ صورتوں میں پورے کرنے کے عمل اور طریقوں کو منظّم کرتے ہیں۔

زندہ رہنے کی اس فصلیت کے دوران' طبعی طور پر تفریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان اس کے لیے مختلف ذوقی مشغلے اختیار کرتے ہیں۔ اس سے تفریحات و فنون وجود میں آتے ہیں...... بہرحال ان اجتماعی کاموں میں اشتراک کی وجہ سے' سارے اجتماع کے مشترک رویے ابھر آتے ہیں۔ بہترین اجتماعات کے اس اشتراک میں حسن اور تناسب کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشترک منظّم رویے کسی کلچر کے ظاہری نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ کلچر کا ایک اہم وصف مشترک منظّم رویہ (Organised behaviour) ہے اور یہ عبارت ہے کل زندگی سے۔

کلچر میں تغیّر و تبدل کا مسئلہ

سائنسی لحاظ سے کلچر چونکہ ماحول ثانی (Second environment) کا نام

ہے اور ظاہر ہے کہ مختلف حالات و حادثات کے تحت' ماحول میں تبدیلی قدرتی امر ہے اس لیے کلچر کے اوضاع واطوار میں تغیر و تبدل بھی قدرتی ہے۔

حالات و حادثات کی تین انواع خاص طور سے قابل ذکر ہے: (اول) کسی نئے مذہبی تجربے کا ظہور (دوم) کسی غالب قوم کا حملہ اور فتوحات اور نئے گروپوں کی مداخلت اور معاشرتی اختلاط اور (سوم) کسی بااثر اور غالب قوم کے تہذیبی اثرات کی یلغار۔

بنیادی ضرورتوں سے جو ماحول ثانی پیدا ہوتا ہے مذکورۂ بالا تین احوال' اس میں بھی تبدیلی پیدا کر لینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

شپنگلر کے خیال میں' جب اقوام' روحانی قوت اور اہم تہذیبی افکار کی اشاعت کے فریضے سے بے نیاز ہو کر' محض مادّی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے وقف ہو جاتی ہیں تو ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے...... اور وہ داخلی امراض کا شکار ہو کر ضعیف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کا کلچر بھی ضعیف اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

ٹوائن بی کی رائے یہ ہے کہ سیاسی غلامی سب سے بڑی لعنت ہے' سیاسی غلبے کے ہمراہ غالب قوم کا کلچر بھی آتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کلچر کی تین سطحیں پیدا ہو جاتی ہیں: ایک سطح' غالب قوم کے طرز زندگی کی' دوسری سطح مغلوب ملک کے عوام کی اور تیسری سطح اس درمیانے ملکی گروہ کی جو حاکموں کے قریب ہو کر ان کا کلچر اختیار کر لیتا ہے۔ ٹوائن بی اس تیسرے گروہ کے کلچر کو بابو کلچر کہتا ہے۔ اس گروہ کے لوگ خود کو عوام سے بلند تر سمجھتے ہیں مگر غالب قوم اس گروہ سے فائدہ اٹھانے کے باوجود' اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس بابو کلچر کے لوگ آہستہ آہستہ عوام کے ایک حصے میں اپنے غلامانہ طرز حیات کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے آپ کو اپنی نظر میں "معزز" بنانے کے لیے ایک "لابی" Lobby تیار کر لیتے ہیں۔ ٹوائن بی کی رائے میں یہ گروہ ذلیل ترین گروہ ہوتا ہے جس کا کلچر غیر قدرتی ہوتا ہے اور محض خود فروشی کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ گروہ عزت نفس سے محروم ہوتا ہے۔

ابن خلدون کی رائے میں اقوام جب بدویانہ عصبیت اور قدرتی جوش حیات سے محروم ہو جاتی ہیں تو ان کے کلچر میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ صرف تن کی آسودگی میں منہمک ہو جاتی ہے۔

دل ڈیورنٹ کے خیال میں "افکار قاہرہ" (Dominant ideas) سے کلچر نمودار ہوتا ہے اور جب یہ افکار کمزور پڑ جاتے ہیں تو وہ کلچر بھی ضعیف ہو کر مٹ جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے میں جب حکمرانوں اور عوام کے مابین ارتفاق (جذبہ'

Marfat.com

رفاقت) سرد پڑ جاتا ہے...... اور حکمران صرف اپنے عیش و آرام میں لگ جاتے ہیں تو ریاست کا کلچر معدوم ہو جاتا ہے۔

اقبال کے خیال میں' جب اقوام خودی کا شعور کھو بیٹھتی ہیں...... اور ان میں وہ تفریحات رواج پا جاتی ہیں جو ضعف واضمحلال کا باعث ہوتی ہیں تو ایسی اقوام بے جہت ہو کر لذت پرستی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ جلال و قوت سے معرّا ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور ان کے ساتھ ان کا کلچر بھی مٹ جاتا ہے۔

سوروکن Sorokin کی رائے میں' مختلف اقوام کے معاشرتی میل جول اور نسلی اختلاط سے نئے قسم کا کلچر پیدا ہوتا ہے مگر اس کلچر کی قوت افکار واحساسات قاہرہ پر منحصر ہے۔

تنقید: ان حکما میں سے ہر ایک کی رائے اپنی اپنی جگہ درست ہے مگر جزواً کلچر بلاشبہ ماحول ثانی ہے مگر یہ صرف مادی ضرورتوں کی تکمیل کا نام نہیں اس میں کچھ مجلسی آداب' کچھ ذوقی مظاہر اور کچھ تخلیقی (غیر مادی عناصر) بھی آجاتے ہیں جو مختلف گروہوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان مظاہرہ کے اختلاف کے پیچھے ڈیورنٹ کے خیال کے مطابق کچھ عقائد عظیمہ کارفرما ہوتے ہیں۔ انہیں سے فرق پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ محض ضرورتوں کی حد تک یکسانی کا زیادہ امکان ہے۔ اسی طرح اوزار اور ہتھیار وغیرہ ہر قوم بنا سکتی ہے اس لیے یہ مابہ الامتیاز نہیں بن سکتے۔ مابہ الامتیاز وہ رویے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق کوئی قوم اختیار کرتی ہے۔

کچھ "سولزیشن" کے بارے میں

صفحات گزشتہ میں کلچر کی جو تشریح ہوئی ہے اس کے باوجود چند نکات ایسے ہیں جن پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ سوال اہم ہے کہ سولزیشن اور کلچر کی اصطلاحوں میں اشتراک واختلاف کی حد کیا ہے؟ اس بحث میں چند ایسی باتوں کی تکرار ممکن ہے جن کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ تاہم اس فصل میں اسے ایک مجموعی جائزے کے طور پر گوارا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سولزیشن

سولزیشن کا لفظ Civitus سے مشتق اور City سے متعلق ہے' لہٰذا اس کے مفہوم میں مدنیت (شہروں کی اجتماعی زندگی) شامل ہے۔ Bagby نے اپنی کتاب

(ص159) Culture and History میں جرمن علمائے اجتماعیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان علمانے کلچر اور سولزیشن میں فرق ظاہر کر کے ان کے الگ الگ مفہوم بتائے ہیں' امریکہ کے بعض علماء نے ان کا تتبع کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ کلچر میں وہ مظاہر شامل ہیں جن میں انسان نے فطرت (Nature) کی تسخیر کی (تسخیر فطرت کے یہ مظاہر اب ٹیکنالوجی کی صورت میں موجود ہیں)۔اس کے برعکس سولزیشن میں وہ مظاہر شامل ہیں جن کا تعلق انسان کا اپنے نفس اور فطرت پر غلبہ پانے سے ہے۔ Man's Sway Over Himself یعنی انسانی جبلتوں کو انسان نے جس طرح کنٹرول کیا جس طرح سنوارا ان کی تہذیب کی اور اس تہذیب سے جو رویے پیدا ہوئے ان کا نام سولزیشن[4] ہے۔ لیکن بعض جرمن اور امریکی علما نے اس کے بالکل برعکس یہ کہا ہے کہ سولزیشن سے مراد' عملی ٹیکنالوجی کا حصول ہے جس کی مدد سے نیچر کی تسخیر ممکن ہے۔اور کلچر سے مراد مجموعہ عقائد وافکار واقدار ہے۔

(دیکھئے Social theory and: Social Structure R.K. Merton

شپنگلر (زوال مغرب کا مصنف) سولزیشن سے مراد کسی اجتماع کا وہ درجہ کمال لیتا ہے جو اپنے عروج پر پہنچ کر آگے کے لیے جامد اور ناقابل ترقی و تخلیق ہو جاتا ہے' یعنی یہ وہ منزل ہے جس کے بعد انحطاط کا آغاز لازمی ہے۔

Bagby کا خیال ہے کہ سولزیشن اس کلچر کا نام ہے جو شہروں میں ظاہر ہوتا ہے..... (یعنی تمدن)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلچر تو اسی عام طرز حیات سے عبارت ہے جو دیہات میں بھی ہو سکتا ہے اور شہروں میں بھی..... لیکن جو کلچر شہروں میں فروغ پاتا ہے اسے سولزیشن کہنا چاہیے۔ (مدینہ = بڑے شہر = مدنیت = تمدن)۔

اس شہری کلچر کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس سے متعلق افراد کو زراعت و فلاحت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ کام دیہات والے کرتے ہیں..... شہری لوگ خوراک پیدا نہیں کرتے بلکہ دوسرے وظائف وصناعات میں تخصیص پیدا کرتے ہیں' وہ سفر وسیاحت کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ اور اپنے ملک سے باہر نکل کر' کسب کمال کر سکتے ہیں۔ وہ بلدیاتی اور فوجی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں' علوم کو ترقی دیتے ہیں۔ اور ان کے پہلو بہ پہلو ذوقی فنون اور تفریحات کا ایک سلسلہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا سولزیشن اس کلچر کا نام ہے جس کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑے بڑے شہر آباد ہوتے ہیں جن میں ایک مرکب اور وسیع الاطراف اسلوب حیات پیدا ہو جاتا ہے جو دیہاتی زندگی میں ممکن

Marfat.com

نہیں...... شہروں کا یہ کلچر سولزیشن کہلاتا ہے۔ اور وہ کلچر جس کی ابتدا میں شہر نہ بھی ہوں مگر اس میں شہروں کی تعمیر (تمدن) کے آثار ہوں سولزیشن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے' لیکن سولزیشن کہلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شہر اس میں بعد میں ضرور پیدا ہوں۔ سولزیشن کو بعض لوگ "برتر کلچر" بھی کہتے ہیں مگر اس سولزیشن کا درجہ تب حاصل ہو گا جب اس کے اندر زندگی کے مرکب عناصر موجود ہوں اور وہ مقامیت سے نکل کر وسعت اختیار کر جائے ورنہ اسے Sub-civilization "ذیلی سولزیشن" سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہ ہو گی۔

ان علماء کی رائے کی روشنی میں' اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سولزیشن کے مقابلے میں کلچر محدود ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ

Culture is the intellectual side of civilization

ترجمہ: کلچر عبارت ہے سولزیشن کے ذہنی و دماغی رخ سے۔

اس کے برعکس بقول ول ڈیورنٹ

Civilization is a social order promoting cultural creation

ترجمہ: سولزیشن عبارت ہے مجلسی نظام سے جو کلچر اسالیب کی تخلیق کرتا ہے۔

Murray کی انگلش ڈکشنری کی رو سے کلچر تربیت شخصیت و تزکیۂ اخلاق کے علاوہ ذوقیات و آداب و تعلیم کا استعمال ہے۔

Cultivation or development of mind, tastes, manners, refinement of education.

اس کے مقابلے میں سولزیشن' کسی معاشرہ (اجتماع) کی ترقی یافتہ تہذیب یافتہ حالت کمال کو کہتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا مقالہ نگار کہتا ہے کہ کلچر کسی قوم کا تمام مجلسی ورثہ (Social heritage) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورۂ بالا ساری وضاحت کے باوجود نہ تو دونوں اصطلاحوں کی قطعی تعریف سامنے آئی ہے اور نہ ان دونوں کے درمیان کوئی واضح امتیاز قائم ہو سکا ہے۔

اندریں حالات صحیح طریق کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حد تک' ایک فرق' اپنی موجودہ ضرورت کے لیے قائم کر لیا جائے اور آئندہ کی بحثوں میں اسی کو بطور بنیاد سامنے رکھا جائے۔

جن نتائج تک میں پہنچا ہوں اور میں نے انہیں سہل سمجھ کر اختیار کر لیا ہے' وہ یہ ہیں۔

1- کلچر کے لفظ کے اندر چونکہ تہذیب و تربیت کا مفہوم از خود شامل ہے لہذا اس سے اولین مراد انسانوں کے وہ انفرادی و مجلسی خصائص ہیں جو (بقول Bagby) لازماً

Marfat.com

موروثی نہیں (یعنی وہ نہیں جو ساری نسل انسانی کو بطور جبلت حاصل ہیں) بلکہ مخصوص اجتماعی (مجلسی) احوال کے اندر، مجلسی تربیت کے ذرائع و وسائل کے زیر اثر، تعلیم و تحصیل و تربیت کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً مخصوص ذوقی رویے، مخصوص آداب زندگی، مخصوص مشاغل و تفریحات وغیرہ۔

(یہ ورثے میں بھی مل سکتے ہیں اور ایک فرد کا معاشرے سے اکتساب بھی ہو سکتا ہے)

2- کلچر فرد کو اجتماع کے حوالے سے ملتا ہے۔ یعنی کلچر رویہ اصلاً اجتماعی ہوتا ہے جس سے ہر ہر فرد اکتساب کرتا ہے۔ اسی لیے یک رنگی و یکسانی اس کی خصوصیت ہے۔

ایک فرد خود "کلچرڈ" ہو سکتا ہے مگر اس کے ذاتی کلچر کو اس گروپ کا کلچر نہیں کہا جا سکتا۔ گروپ کے کلچر سے فرد کا کلچر متعین ہوتا ہے۔

3- ظاہر ہے کہ کلچر ایک محدود اصطلاح ہے۔ کلچر میں جب وسعت پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے مخصوص عوامل کے اثر سے سولزیشن پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک سولزیشن کے اندر کئی ذیلی کلچر بھی ہو سکتے ہیں تاہم بعض امتیازات کے باوجود پوری سولزیشن کا نقش مشترک ان سب میں ضرور موجود ہو گا۔

4- کوئی کلچر سولزیشن کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، مگر ہر سولزیشن کے لیے کلچر ضروری ہے خواہ وہ بسیط ہو یا مرکب۔

5- سولزیشن کسی کلچر کی ترقی یافتہ اعلیٰ اور وسیع تر شکل ہے۔ اس کا تعلق شہروں کے ظہور اور ان کی مخصوص زندگی (= تمدن =) سے ہے جہاں زندگی کے نئے اسالیب پیدا ہوتے ہیں اور دیہات کے کلچر کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

شہروں میں بڑے بڑے ادارے پیدا ہوتے ہیں۔ مجلسی تنظیمات ظہور میں آتی ہیں۔ اور فطرت کی تسخیر کے لیے ایجادات و صناعات پیدا ہو جاتی ہیں۔ تعلیم، صنعت، کارخانے، تجارت، قوانین وغیرہ وغیرہ۔

بعض لوگ مذہب کو بھی سولزیشن کی پیداوار قرار دیتے ہیں لیکن میں مذہب کو سولزیشن کے خالق وسائل میں سے ایک وسیلہ سمجھتا ہوں (کیونکہ ہر سولزیشن کے کچھ سرچشمے ہوتے ہیں جو افکار اور عقیدوں کی شکل میں کارفرما رہتے ہیں)۔ کوئی سولزیشن کسی منظم مذہب کے بغیر بھی ظہور میں آ سکتی ہے۔ لیکن ہر سولزیشن کے لیے افکار و اقدار کا ہونا ضروری ہے جنہیں Will Durant ول ڈیورنٹ (Dominant ideas) (افکار قاہرہ) کا نام دیتا ہے......

اس کتاب کے نقطۂ نظر سے مناسب یہ ہو گا کہ کلچر سے مراد بالعموم وہ اسالیب

Marfat.com

حیات اور ذوقی رویے لیے جائیں جو خاص عقائد کے زیر اثر کسی تمدن (Civilization) میں آزادانہ پیدا ہو کر حسن کی شان پیدا کر لیتے ہیں، وہ متعلقہ معاشرہ کے اکثر افراد کے مجلسی رویے بن جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں جو بحثیں بھی آئیں گی وہ ان تمدنی مظاہر...... صناعات، ادارات و ایجادات، تعلیمات کی تنظیمات وغیرہ سے کم متعلق ہوں گی جن میں عقل و تجربہ کا دخل ہے۔ یہاں صرف وہ مظاہر آئیں گے جن کا تعلق ذوقیات اور اس کے مظاہر خارجی سے ہوگا۔ البتہ ضمناً تمدن کے انعکاس کا آجانا قدرتی ہے۔ چنانچہ ادارت وغیرہ کے بارے میں مجلسی رویے اور تصورات اس میں شامل ہوں گے۔

حوالہ جات

1. Agriculture Horticulture میں اب بھی موجود ہے۔

2. چند اور تعبیریں ملاحظہ ہوں:

1. Culture is value;
2. It is norms;
3. It is learned or symbolizing or habitual behaviour;
4. It is a stream of ideas or a social organism;
5. Ways of life;
6. All aspects of social life;
7. Major departments of human activity: religion, politics, economics, art, science, technoligy, education, language and customs;
8. Culture includes modes of thinking and feeling and behaviour-but not any invisible entity which determines these modes.

Culture is regularities of those modes of behaviour, internal and external, of the members of a society, which are not clearly hereditary in origion (Culture and History, 1958)

3. Bronislaw Malinowsky کی کتاب A Scientific Theorv of Culture، 1944ء۔

4. Bagby کی محولہ بالا کتاب

Culture: The sway of man over nature

Civilization-man's sway over himself, modification of human instincts by society.

ایک تعریف یہ ہے:

Civilization is the culture of cities and dwellers of cities, a majority of whom are not engaged in producing food (bagby)

دوسری تعریف یہ ہے:

A developed or advanced state of human society: a particular stage or particular type of it.

Marfat.com

دوسرا باب

مُسلم حکما کے تصوّرات (کلچر کے بارے میں)

کلچر کی ان جدید (مغربی) تعبیرات کے بعد' ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ ان جدید تعبیرات کے حوالے سے یہ جستجو کی جائے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں' ان مظاہر کے بارے میں کیا کچھ کہا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ادب میں کلچر کی مثیل کوئی معیّن اصطلاح موجود نہیں تاہم جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس کے موجودہ مفہوم کے قریب قریب کچھ الفاظ مل جاتے ہیں مثلاً تہذیب' اخلاق' حسن معاشرت' حسنِ ادب (آداب) وغیرہ وغیرہ مگر یہ سب دین کے اجزا تھے۔ اسلام میں ہر شے اور ہر تصور "کلیت" کے عقیدے پر مبنی ہے۔ اس میں دین اور دنیا' خارجی اور داخلی (یعنی نجی اور پبلک) زندگی' بلکہ جسمانی' دماغی اور روحانی ہر سلسلۂ عمل کے لیے الگ الگ خانے موجود نہیں۔

قرآن مجید ایک مومن کو کُل زندگی کا تصور دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے کُل زندگی کی تطہیر و تہذیب کی توقع رکھتا ہے۔ عمل کا حسن عقیدے کے (ایمان) کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ عقیدہ سچائیوں پر ایمان کا نام ہے اور خارج میں اس کے عمل کے معنی ہیں تقویٰ اور عدل۔ عدل انسانی زندگی کی بنیادی قدر ہے:

قرآن مجید میں آیا ہے:

اِعدِلُوا ھُوَ اَقرَبُ للتَّقوٰی : یہ عدل فرد اور اجتماع دونوں سے متعلق ہے۔ اپنی ذات اور دوسرے کی ذات دونوں اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح تقویٰ سے مراد برائیوں سے اجتناب بھی ہے اور فضیلتوں میں بھی بے اعتدالی (افراط و تفریط) سے احتراز بھی۔ تقویٰ محض ایک انفرادی رویہ نہیں سوشل رویہ بھی ہے' یہ ضبط نفس ہے جس کی مدد سے دوسروں کے لیے قربانی کی گنجائش نکلتی ہے لہٰذا عدل و تقویٰ کے اصول پر جو معاشرہ پیدا ہوتا ہے وہ حسین ترین معاشرہ ہوگا۔

(بنابریں اسلامی کلچر کی بنیاد ان دو واضح علامتوں پر ہے ایک عدل پر دوم تقویٰ پر۔

یہ بالکل واضح ہے کہ آنحضرتؐ خلق کریم کا مثالی نمونہ تھے۔ آپؐ کے شمائل و سنن بہترین انسانی اخلاق کا مظہر تھے۔ اسی خلق عظیم سے وہ آداب پیدا ہوئے جو اسلامی کلچر کی بنیاد بنے۔ صحابہؓ کی جماعت نے درجہ بدرجہ اسی نمونے کے مطابق خود کو ڈھالا۔ مسلمان صوفیہ و حکمانے اپنی کتب اخلاق اور کتب آداب کا مواد انہیں نمونوں سے حاصل کیا۔ ان عقائد' اخلاق اور آداب پر عمل کرنے والوں کے ذریعے ایک توانا اور حسین کلچر نمودار ہوا جسے اسلامی تہذیب کہیئے یا کلچر کہیے مطلب ایک ہی ہے۔ اس کی وسیع تر اور زیادہ منظم خارجی صورت وہ تمدن تھا جسے ہم اسلامی تمدن کہتے ہیں۔ یہ تہذیب اور یہ تمدن ان عقائد سے متاثر ہوا جن سے سلف سرشار تھے۔ ان تہذیبی و تمدنی مظاہرہ میں سب سے زیادہ جن قدروں کی نمود ہوئی وہ وہی تقویٰ اور عدل کی اقدار تھیں۔ جن کے ساتھ دوسری اہم صفات کو شامل کر لیا جائے تو ان میں وحدت و کثرت۔

Unity in variety متانت Serenity وقار Dignity اور استقامت uprightness بھی شامل ہو سکتی ہیں انہیں سے ایک ذہن' ایک شخصیت کی تکمیل ہوئی جو مسلم قوم کے کلچر میں بھی نمایاں ہوئی۔ آئندہ کے صفحات میں انہیں کی تفصیل آ رہی ہے۔

مسلم کلچر کی بحث کے لیے دو عنوانات لازمی ہیں: اول: ان عقائد و افکار کی تفصیل جو مسلم کلچر کے باطنی سرچشمے تھے۔

دوم: وہ خارجی مظاہر جو مسلمان قوم (اقوام) کے احوال' عادات' آداب اور ذوقیات و مشاغل میں عملی طور پر ظہور پذیر ہوئے۔

اس باب میں اس بحث کے پہلے عنوان پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

مسلم حکما کے مدِنظر زندگی کے دونوں شعبے رہے ہیں' یعنی ظاہر اور باطن دونوں مل کر ایک مکمل شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کی تفصیلات کتب فقہ و عقائد' کتب اخلاق' کتب ادب' کتب حکمت' کتب تصوف وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان سب کا مقصود فرد کی حد تک حسن عمل اور اجتماع کے دائرے میں کمال اجتماعی ہے علمائے ادب و اخلاق نے اس حسن عمل اور کمال اجتماعی کے لیے قرآن مجید اور سنت رسول پاکؐ سے اصول اخذ کیے۔ انہیں اصولوں سے اسلامی کلچر تہذیب اور اس کی وسیع تر شکل (تمدن) کی نظری و عملی تشکیل ہوئی جسے باضابطہ طور پر مسلم حکمانے علم اخلاق کا ایک حصہ قرار دیا چنانچہ کتاب الطہارہ اخلاق

Marfat.com

ناصری (فارسی) اور اخلاق جلالی (فارسی) جیسی کتابیں اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ ان میں مذکورۂ بالا انفرادی حسن عمل اور کمال اجتماعی (یعنی منزلی اور سیاسی شہری زندگی) کے اصول و کوائف موجود ہیں۔ وسیع دائرے میں اسلاف نے ان سب شعبوں کو علم اخلاق میں شامل کیا ہے اسی سے کلچر نمودار ہوا۔

اسلامی تہذیب کی تشکیل و تنظیم کے لیے اصولی حد بندی سب سے پہلے محدثین اور فقہائے اسلام نے کی۔ انہوں نے عقائد' عبادات اور معاملات کے ابواب میں پاکیزہ' بامعنی اور بااصول زندگی کے اصول بتائے۔ ان عقائد و عبادات کی تشریح کی جن سے پاکیزہ اور بامعنی زندگی کو تقویت ملتی ہے۔ شب و روز کی انفرادی زندگی کے آداب مرتب کیے' عائلی اور خاندانی زندگی میں حسن عمل اور خوشگوار معاشرت کے اصولوں کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد سیاسی' قومی اور بین الاقوامی حسن عمل کے آداب مرتب کیے۔ انہیں سے اسلامی کلچر کے سرچشمے پھوٹے۔

حکمائے اسلام میں مسکویہ' فارابی' غزالی' محقق طوسی' ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے تہذیب و تمدن کے اصولوں کو باضابطہ بنیادوں پر منظم کیا۔ یہاں ان کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

ابن مسکویہ[1]

اعلیٰ کلچر کی غایت: خیر و سعادت (فوز و سعادت)

قدیم کتابوں میں تہذیب اخلاق اور تمدن کی بحثوں میں بار بار یہ ذکر آیا ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا کمال انقیاد نفس اور تطہیر نفس میں ہے۔ اور اس کا پھل (غایت) خیر و سعادت ہے۔ ابن مسکویہ نے کتاب الطہارۃ (اور ایک حد تک الفوز الاصغر) میں ان موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ محقق طوسی نے اپنی کتاب اخلاق ناصری میں ابن مسکویہ کے خیالات کا اثر قبول کیا ہے۔ میں ان دونوں بزرگوں کے خیالات کا خلاصہ یہاں پیش کر کے اعلیٰ کلچر کی غایت کا ذکر کروں گا۔

مسکویہ کے نزدیک خیر کی دو قسمیں ہیں: خیر مطلق اور خیر باضافت۔ خیر مطلق وہ ہے جس میں تمام لوگ مشترک ہیں (یک معنی است کہ ہمہ اشخاصِ درآں اشتراک دارند) اور اضافی وہ ہے جو بعض میں ہو اور بعض میں نہ ہو۔

خیر کی کچھ اور اقسام بھی ہیں: (1) شریف' (2) ممدوح (3) نافع اور (4) خیر بقوۃ

Marfat.com

شریف ترین خیر عقل و حکمت ہے۔ اسی طرح خیر کی بہت سی اور توجیہات ہیں۔
سعادت کی بھی دو قسمیں ہیں: (1) نفسانی' (2) جسمانی۔ لیکن مختلف حکما نے اسے پورے تمدنی نظام پر پھیلا دیا ہے۔ منزلی' تمدنی اور بین الاقوامی۔
بعض کے نزدیک سعادت صرف روحانی عمل ہے لیکن متاخرین کی اکثریت اسے جسمانی و روحانی دونوں پر مشتمل سمجھتی ہے۔
محقق طوسی کے نزدیک وہ انفرادی و اجتماعی زندگی جسے خیر و سعادت کہا جا سکتا ہو' اعلیٰ کلچر ہی میں ظہور میں آسکتی ہے۔ انسان فطری طور سے تمدن کا محتاج ہے اور تمدن اجتماع کا طلبگار ہے اور اجتماع ارتباط افراد کا ضرورت مند ہے اور ارتباط محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا کلچر کا سرچشمہ محبت ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسکویہ اور نصیر الدین طوسی کے نزدیک کلچر بشریاتی مسئلہ بھی ہے اور نفسیاتی بھی کیونکہ اس کی بنیاد ضرورتوں پر ہے جو زندہ رہنے کے لیے لازمی ہے۔ یہ ضرورتیں باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہیں۔ یہیں سے کلچر کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بغیر معاشری ضرورتوں کو حسین شکل دینے کا آغاز ہوتا ہے اور ترقی یافتہ کلچر انہیں معاشرتی تقاضوں کی حسن تنظیم کا نتیجہ ہے' اسے پرانے بزرگ استکمال کہتے تھے۔ جس کے نتیجے میں خیر اور سعادت معاشرے کے حصے میں آتی ہے۔
یہاں تک ابن مسکویہ کے خیالات کا خلاصہ ہے جس کی تشریح ناصری نے کی ہے۔ اب تاریخی ترتیب کو برطرف رکھتے ہوئے مکتب کی مناسبت سے میں نصیر طوسی کے خیالات قدرے شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔
نصیر الدین طوسی کی اخلاق ناصری کا پہلا حصہ حکمت خُلقی (تہذیب الاخلاق) تمام تر ابنِ مسکویہ کی کتاب الطہارت کا ملخص ہے البتہ اس کے دوسرے حصے (یعنی حکمت منزلی[2] اور حکمت مدنی[3]) دوسرے حکما کی تحقیق سے ماخوذ اور طوسی کے اپنے غور و فکر پر مبنی ہیں۔
طوسی کے تصور کی رو سے کلچر (تہذیب و تمدن) کا مسئلہ حکمت عملی کے اہم مسائل میں سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حسن عمل اور کمال اجتماعی نسل انسانی کا ایک عظیم اکتساب ہے اور اس اکتساب کے اصول ایک علم اعلیٰ (حکمت) ہیں۔ اور حکمت میں علم اور عمل دونوں شامل ہیں۔
حکمت کے معنی ہیں "دانستن چیزہا چنانکہ باشند و قیام نمودن بکارہا چنانکہ باید' بقدر استطاعت' تا نفس انسانی بکمالے کہ متوجہ آنست برسد"

Marfat.com

ترجمہ: ”حکمت حقائق اشیا کا جاننا ہے جیسی کہ وہ ہیں اور کاموں کا کرنا ہے جیسا کہ چاہیے اور جہاں تک کہ انسان کے لیے ممکن ہے تاکہ نفس انسانی کمال مطلوب کو حاصل کرے۔“

طوسی کے بیان کے مطابق حکمت کی ایک قسم نظری ہے اور دوسری عملی' اور ظاہر ہے کہ کلچر کے خارجی ظہور کا مسئلہ حکمت عملی سے تعلق رکھتا ہے' جس کے تین شعبے ہیں: 1 تہذیب الاخلاق (یعنی انفرادی حسن عمل) 2 تدبیر منزل (یعنی عائلی منزلی زندگی کی موزوں تنظیم) اور 3 سیاست مدن (یعنی اجتماعی شہری سیاسی زندگی کی متناسب تشکیل)

طوسی کی تشریح سے چند نتیجے نکلتے ہیں: اول یہ کہ کلچر کا مسئلہ عام اور عمل دونوں سے متعلق ہے (علم کلچر کی روح ہے اور عمل اس کا خارجی بدن: دوم' یہ کہ کلچر خود دو شے نہیں۔ ضابطوں اور اصولوں کا پابند ہے۔ بے اصول بے عقائد آزادانہ طرز حیات کو طرز زندگی یا محض معاشرت کہہ دیں گے مگر کلچر نہ کہیں گے اور تیسرا یہ کہ کلچر کی ایک غایت ہوتی ہے جسے اس کا ثمر سمجھ لیجئے۔ یہ غایت حصول کمال ہے جس کے نتیجے میں انسان کو خیر و سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں ثمر پُر لذت اور راحت بخش ہوتے ہیں۔

طوسی نے ایک فصل میں جس کا عنوان ہے ”در بیان آنکہ نفس انسانی را کمالے و نقصانے ہست“ کمال کی تشریح یہ کی ہے: ہر شے اپنی تخلیق کے مقصد کو جب حاصل کر لے تو یہ اس کا کمال ہوتا ہے۔ طوسی کا نظام استدلال یہ ہے کہ انسان اشرف موجودات عالم ہے۔ اس کا یہ شرف اس وجہ سے ہے کہ وہ عقل و ادراک کا مالک ہے۔ پھر وہ اپنے ارادے سے عمل کر سکتا ہے۔ اور ترقی کر کے درجہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

چونکہ یہ کمال' عقلی ادراک[1]' عمل کرنے[2]' اور ترقی[3] کرنے پر منحصر ہے اور یہ باتیں سب انسان میں یکساں نہیں ہوتیں اس لیے حصول کمال کے مدراج و مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں لہٰذا کمال کا حصول سعی کی تناسب سے ہوگا۔ یہ بات اجتماعات پر بھی صادق آتی ہے۔

طوسی کے نزدیک مراتب کمال کئی ہیں: ان میں سے ایک سلامت' دوسرا سعادت' تیسرا نعمت' چوتھا رحمت اور عقبیٰ میں اس کا نام ملک باقی' سرور حقیقی اور قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک۔ کامل سرور اور اطمینان) ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کے لیے تنظیم افعال (ڈسپلن) کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ مسلم حکما کے نزدیک کلچر کا ایک بنیادی اصول

Marfat.com

Decipline and restraint ''نظم و ضبط نفس'' ہے۔ اور وہ اس حیوانی آزادی کا روادار نہیں جو اسفل حیوانات کو قدرت کی طرف سے از خود حاصل ہے۔ انسان کا کمال' حیوانی آزادیوں کی بدنمائی اور بے اعتدالی کو رفع کر کے 'ان میں شرافت (حسن) کی شان پیدا کرنا ہے۔

طوسی کی یہ اصطلاحیں تقویٰ اور عدل سے بظاہر مختلف ہیں مگر غور کیا جائے تو ان کے قریب ہیں اگرچہ ان پر یونانیت کا رنگ چڑھا ہوا ہے کلچر کا فلسفیانہ تجزیہ کرنے والوں میں مشہور فلسفی الفارابی بھی ہیں۔

الفارابی

جو حکمت میں اپنے نظریہ فیض (الفلسفتہ الفیضیہ) کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب آراء اہل المدینتہ الفاضلتہ کو خدا (الموجود الاول) اور نفی الشریک اور نفی الضد وغیرہ سے شروع کر کے یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم' حکیم' حق حیّ اور حیٰوۃ ہے۔ اس ضمن میں حکمت کو قدر اعلیٰ قرار دے کر حکمت کو اعلیٰ کلچر کا سر چشمہ قرار دیتے ہیں۔

الفارابی مسلم حکما کے عام انداز کے مطابق مدینہ فاضلہ یعنی Centre of Culture کی اساس حکمت پر قائم کرتے ہیں 'ان کی رائے ہے کہ اجتماع انسانی اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں کمال تبھی حاصل کر سکتا ہے جب وہ (یا مدینہ سے متعلق سب افراد) فرداً و اجتماعاً حکمت کے اصولوں پر عمل کر کے' اجتماعی عمل کو ایسا حکیمانہ عمل بنا دیں جو انسان کی فلاح و سعادت کا منبع بن جائے۔

الفارابی مذکورہ کتاب میں مراتب موجودات کے ذکر کے بعد' مادہ و صورت کا حوالہ دے کر عقل کے شرف اور نفس انسانی کے قویٰ اور نفس واحدہ میں ان کے متبدل ہو جانے کی بحث کے بعد' سعادت (استکمال) کی تشریح کرتے ہیں۔ گویا کلچر (مدینہ فاضلہ) کا اجتماعی نصب العین سعادت ہے۔

الفارابی کے نزدیک مدینہ کی ہیئت اجتماعی کے ارتقا کی بنیادیں دو ہیں:

اوّل: وہ فطری ملکہ جو انفرادی طور پر انسان کو سعادت اور استکمال کا آرزو مند رکھتا ہے۔

دوم: مادی زندگی کی تنظیم کی خاطر اجتماع و تعاون کے لیے انسانوں کی احتیاج۔

انسان ان دونوں بنیادوں کے استحکام...... (اور استکمال کے لیے) اجتماع کا ضرورت مند ہے۔

اب اجتماع یا تو کاملہ ہوتے ہیں یا غیر کاملہ...... پھر کاملہ یا عظمٰی یا وسطٰی یا صغریٰ ہوں گے' غیر کاملہ: اہل قریہ' اہل محلہ اور اسی طرح چھوٹے چھوٹے گروہ تک۔

الفارابی کے نزدیک (اصول حکمت پر چلتے ہوئے) صرف مدینہ (اجتماع الکاملہ) ہی افضل و اکمل ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ مدینہ کے اجتماعات بعض اوقات خلافِ حکمت' اعمال (شرور) کے مرتکب ہو جاتے ہیں......'

مدینہ فاضلہ صحت مند بدن (البدن التام الصحیح) سے مشابہ ہوتا ہے۔ جس کا سارا نظام' تعاونِ اعضا سے چلتا ہے۔ اسی طرح نفوس میں قانون اتصال فطری بھی کارفرما ہوتا ہے۔ بعض نفوس بعض سے فطری الفت رکھتے ہیں۔

الفارابی نے رئیس اجتماع اور ریاست کا تذکرہ بھی اسی اصول سے کیا ہے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ صحیح رئیس الاجتماع وہی ہوگا جو حکیم ہوگا اور حقیقی ریاست بھی حکمت کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی (کیونکہ حکمت ایک دماغی عقلی سلسلہ بھی ہے اور فطری و روحانی معاملہ بھی۔

رئیس المدینۃ الفاضلہ کے اوصاف میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس کا ایک عظیم وصف سچائی کی محبت (محبا للصدق) اور جھوٹ سے نفرت (مبغضا للکذب) ہوتا ہے۔ زیرک عاقل' جید الفہم۔ خوش گفتار' علم پسند اولوالعزم...... بہرحال اسے عالم اور حکیم باتدبیر اور شجاع ہونا چاہیے۔

مدینہ فاضلہ کے مقابلے میں مدینۃ الجاہلۃ' مدینۃ الفاسقہ' مدینۃ المتبدلہ' مدینۃ الضالہ اور یہ سب وہ اقسام اجتماع ہیں جن میں سعادت کا حصول نصب العین نہیں ہوتا بلکہ لذات جسمانی' حب جاہ و مال وغیرہ مدنظر ہوتا ہے۔

الفارابی کی نظر میں کلچر کے مظاہر دو ہیں:

اول: صناعات میں کمال...... جو معاش کی بنیادی اور ضمنی صورتوں سے متعلق ہے۔

دوم: سعادات...... وہ مظاہر جو اجتماع کی ماوراء المعاش سرگرمیوں کے بذریعۂ عقل و جاذبۂ روحانی متشکل ہو کر کمال پاتے ہیں۔ (یہ تشریح Bagby کی توضیحات کلچر کے قریب جا پہنچتی ہے۔)

صناعتوں میں فضیلت کی دو شرطیں ہیں:

اول: یہ کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی حسن تنظیم اور دیانت و عدل کے اصول پر مبنی ہو اور دوم' یہ کہ صناعات شرف انسانی کے مخالف نہ ہوں اور کمال روحانی

Marfat.com

(سعادت) میں مانع نہ ہوں۔

مدینۃ الفاضلہ کے لوگ مادی ترقی اور روحانی کمال دونوں کے لیے سرگرم ہوتے ہیں...... اس کی ضد دوسری انواع مدینہ کے لوگ صرف مادیات اور لذات جسمانی کو اپنا مقصود ٹھہراتے ہیں۔ جیسا کہ یورپ اور امریکہ کی موجودہ تہذیب میں ہے۔

الفارابی نے ارتباط واشتراک کے اصولوں سے بھی بحث کی ہے۔ اور اس کی بنیاد بھی حکمت ودیانت کو قرار دیا ہے۔ اور اس کی اعلیٰ صورت کا دارومدار عدل پر رکھا ہے۔

ان تصریحات سے کلچر کے بارے میں الفارابی کے تصور کا پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے...... کسی کلچر کے اعلیٰ وافضل ہونے یا ناقص وناتمام یا خراب ہونے کے اصول واضح ہیں...... جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ تمدن صرف عقلی وروحانی تڑپ سے وجود میں آتا ہے اور شرف وکمال کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تعاون کلچر کی فطرت ہے۔ حکمت اس تعاون کو بامقصد اور باثروت بناتی ہے اور خیر وسعادت اس کی غایت ہے۔

کلچر کی بحث اخلاق وتربیت کی کتابوں میں

اخلاق کی باضابطہ کتابوں کے علاوہ ایک سلسلہ تصانیف ایسا بھی ہے جو فرد کی تطہیر کے ساتھ کمالات عقلی اور نظامات علمی، آداب مجلسی اور ذوقیات کی عملی صورتوں سے بحث کرتا ہے۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ سے 'مسلمانوں کے کلچر اور اس کے وسیع عناصر ترکیبی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں بعض کتابیں المحاسن والاضداد کے نام سے۔ بعض المحاسن والمساوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن عبدربہ کی عقد الفرید اور القلقشندی کی صبح الاعشیٰ اس عظیم کلچر کا مفصل نقشہ پیش کرتی ہیں جو ابھی پچھلی صدی تک تھوڑے سے فرق کے ساتھ سارے عالم اسلام میں موجود تھا۔

امام غزالیؒ کی کتاب کیمیائے سعادت اور نصیحۃ الملوک بظاہر اخلاق کی کتابیں ہیں لیکن فی الحقیقت اسے کلچر کے مظاہر واصول کی کتابیں سمجھنا چاہیے۔

اگر اس سلسلے میں غزالیؒ کے جامع تصورات کا سراغ لگانا ہو تو احیاء علوم الدین کے علاوہ ان کی کتاب کیمیائے سعادت کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا۔ غزالیؒ نے سب سے پہلے کلچر کی جسمانی حیوانی بنیادوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی ترقی کے سلسلے میں معاشی ضرورتوں کی خاطر "فطری ضرورت تعاون" کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اسے روحانی ملکات کے ذریعے استکمال اور تہذیب نفس تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے ضبط نفس اور عدل والفت کے علاوہ مکمل آداب

Marfat.com

زندگی اور مفصل قواعد معاشرت و سیاست کی جزئیات بتفصیل واضح کی ہیں۔ گویا امام صاحب کے نزدیک اعلیٰ فرد اور اعلیٰ کلچر اور بامقصد معاشرہ 'خود بخود وجود میں نہیں آجاتا بلکہ عقلی عمل کی تنظیم اور روحانی ریاضت سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معاشرہ محض حیاتیاتی اور معاشی ضرورتوں کی تکمیل سے نہیں بنتا بلکہ اس کی ترقی و کمال کے لیے عقلی و روحانی اسباب و ممدات کی بھی ضرورت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حیاتیاتی اور معاشی ضرورتوں سے جو تعاون پیدا ہوتا ہے اس میں صفت اعتدال (حسن خیر اور سعادت) پیدا کرنے کے لیے روحانی محرک لازمی ہے' ورنہ یہی معاشی اور حیوانی تقاضے اختلال تمدن (غضب' استحصال' جبر و قہر اور بددیانتی) کا موجب بن جاتے ہیں...... ان خبیث رجحانات کو مٹانے کے لیے اور ایک کیفیت عدل پیدا کرنے کے لیے سخت انقیاد نفس کی ضرورت ہے جو عقلی عمل بھی ہے اور ذوقی و وجدانی بھی' نیز شعوری و انقیادی بھی۔

غزالیؒ کی کیمیائے سعادت ہمارے قدیم معاشرے کے جملہ اخلاقی آداب کی کتاب ہے۔ وہ یہ بھی بتا سکتی ہے کہ مسلم معاشرہ کیا تھا اس کی بہترین تمدنی اقدار کیا تھیں۔ اور آئندہ کے کسی کلچر کی تہذیب کن بنیادوں پر استوار کی جا سکتی ہے۔

اگر اس طویل موضوع کو دو لفظوں میں بیان کرنا ہو تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ مسلم معاشرے کی اعلیٰ اقدار تمدنی دو تھیں: (1) تقویٰ (Restraint) اور (2) عدل۔ انہیں دو اقدار سے سارے انفرادی و اجتماعی آداب' رویے اور تخلیقات ظہور میں آئے۔ یہ سب آداب صفت تناسب سے آراستہ نظر آتے ہیں مگر یہ تناسب 'اصول حکمت پر قائم ہے۔

اب ہم صدیوں کا فاصلہ عبور کر کے 'دور آخر کے ایک حکیم عمرانیات شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خیالات پیش کرتے ہیں:

حضرت ولی اللہ دہلویؒ: حضرت شاہ صاحب کی تصانیف دور انحطاط کے اصلاحی و احیائی ادب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب نے گزشتہ علماء و حکما سے استفادہ کر کے 'اکثر مسائل کے لیے خاص اپنی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ کلچر کے مسئلے کے لیے بھی ان کی اصطلاحیں اپنی ہیں۔ ان کا اصولی نظام فکر تقریباً وہی ہے جو پرانے علمائے اخلاق نے اختیار کیا ہے لیکن ان کی پیش قدمی عمرانی (Sociological) ہے اور تجزیاتی عقل اور حیاتیاتی اصول سے وہ خاص طور سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کی رائے میں انسان میں دو صفحات ہیں: (1) بہیمی اور (2) ملکی۔ انسان کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہیمی صفحات پر غلبہ پالے اور ملکی اوصاف (بقدر استعداد) اپنے اندر پیدا

Marfat.com

کرلے۔اس کے بعد شاہ صاحب علم بشریات (Anthropology) کے ماہرین کے انداز میں'بشر کو اپنے پہلے ماحول سے دوسرے ماحول کی طرف بڑھتا دکھاتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ انسان چونکہ اپنے معاش کے لیے تنہا کچھ نہیں کرسکتا اس لیے تعاون کی ضرورت اقتضائے فطری ہے۔اسی ضرورتِ تعاون سے اجتماع ظہور میں آتا ہے۔

اس اجتماعیت کے استحکام کے لیے انسان کو چار ارتفاقات سے بہرہ ور کیا گیا ہے' ارتفاق کے معنی ہیں:"میلانِ تعاون و تناصر بنائے جذبہٗ رفاقت۔"

شاہ ولی اللہؒ کا سارا تصور انہیں "ارتفاقات" پر مبنی ہے۔اور یہ ارتفاقات ان کے نزدیک کل زندگی پر حاوی ہیں' ہر چند کہ معاشرہ کا سنگ بنیاد فرد ہے مگر فرد تنہا کچھ نہیں اچھے معاشرے کے لیے صالح افراد کی ضرورت ناگزیر ہے۔ یہ یافراد صالح کلچر پیدا کرتے ہیں۔اس لحاظ سے جہاں اجتماع اہم ہے وہاں فرد کی ذمے داری فوق الکل ہے۔اس ذمے داری کے احساس کو بیدار کرنے کے لیے داخلی طور سے ایمان (یعنی خدا اور رسولؐ پر یقین اور نیکیوں کے حسن پر پورا اعتقاد درکار ہے اور ظاہری طور سے طہارت اور حسن معاملت ضروری ہے۔

یہ دونوں اوصاف'اندورنی انقلاب کے طلبگار اور مصالح کلیہ کی خاطر لازمی ہیں لیکن یہ تسلیم شدہ ہے کہ اس انقلاب کے لیے شدید قربانی کرنی پڑتی ہے۔اور دوسروں سے نباہ کرتے وقت'اپنے رویے پر خاص کڑی گرفت مطلوب ہوتی ہے۔اس کے لیے خدا کی طرف توجہ اور اس کا "ذکرِ کثیر" درکار ہوتا ہے۔جب معاشرے کا ہر ہر فرد اس صفت سے متصف ہو کر باخدا'ایمان دار اور پاک ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ان "غنی دل" افراد کے شعوری اجتماع سے ایک عادل معاشرہ وجود میں آتا ہے جو نیکیوں کو پھیلاتا اور برائیوں سے پاک ہو کر تخلیقات عالیہ کا باعث بنتا ہے ورنہ کلچر میں اختلال واقع ہو جاتا ہے جس کی پہچان یہ ہے کہ خود غرضی اور عیش پرستی عام ہو جاتی ہے جو دوسروں پر ظلم کراتی ہے۔ہر فرد اپنے ہی نفس کی غلامی کرتا ہے۔تعاون (ارتفاق) ختم ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے کلچر کی بحث میں صوفیہ کے نظام تربیت کے اکثر حصے کو اپنایا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ صوفیہ کی توجہ ضرور مرکوز رہتی ہے مگر شاہ صاحب فرد کی اس تطہیر سے تمدنی غرض بھی وابستہ کرتے ہیں۔اس کا نام ان کے نزدیک "سعادت" ہے اور یہ لفظ فرد و اجتماع دونوں کے ضمن میں استعمال کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب نے ارتفاقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کئی طبقات کا ذکر کیا ہے'

Marfat.com

ان میں سابقین ہیں (جو اصحاب اصطلاح[2] اور اصحاب تجاذب[3] پر مشتمل ہے۔) پھر مفردین' صدیقین' شہدا اور علمائے راسخون ہیں)۔ دوسری قسم اصحاب الیمین کی ہے' تیسری قسم اصحاب الاعراف کی ہے اور آخر میں فُسّاق اور فجار ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک ارتفاقات کا بہترین ثمر کو تدبیر منزل سے اعلیٰ' سیاسیات ملیہ ہے۔ جس کا نظام امام سے وابستہ ہے۔ اور یہ شخص الفارابی کا حکیم نہیں بلکہ نبی اور اس کی خلافت میں خلیفہ یا امام کہلاتا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ شاہ صاحب نے کلچر کو انسان کی فطری معاشی مادی ضرورتوں سے شروع کر کے (بذریعہ ارتفاق=تعاون) محض ضرورت کی مجبوری سے نہیں بلکہ اسے ایک روحانی فریضہ قرار دے کر ایک آئیڈیل مدنیت (Higher Culture) تک پہنچایا ہے جس میں سب کے لیے سعادت ہوگی اور یہ سعادت ہی ہر کلچر کی غایت ہے۔[4]

ابن خلدون

میں ابن خلدون کا ذکر آخر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کا انداز فکر مذکورہ بالا سب حکما سے جدا ہے۔ اسے عمرانی سائنسی انداز کہا جا سکتا ہے۔ اس نے کلچر کو تاریخ کے وسیع تر دائرے میں رکھ کر اس کے اسباب و عوامل سے بحث کی ہے۔ اور اس کا نام علم العمران رکھا ہے۔ عمران کے معنی ہیں آبادی و معموری۔ یہ علم آج کل سوشیالوجی کے نام سے موسوم ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک عمران کا نقطہ' آغاز وہ اجتماع ہے جس کی اولین تنظیم بدْو[9] (دیہات' بادیہ) کی زندگی میں ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے مدنیت تک پہنچتی ہے جسے ابن خلدون حضارت کہتا ہے۔

حضارت کا عروج بڑے شہروں کے ظہور کی صورت میں ہوتا ہے۔ (یہ بیان جس نصل میں ہے اس کا عنوان ہے "فی البُلدان" والامصار والعمران)۔

ابن خلدون کے نزدیک عمران انسان کے طبعی تقاضوں میں سے ہے۔ اس کی تشکیل و تنظیم پر جغرافیائی احلات کا بڑا اثر ہوتا ہے جس کے باعث اس کی صورتیں جغرافیائی ماحول کے مطابق بدل جاتی ہیں۔

علامہ موصوف کی رائے میں عمران کے ارتقا میں' انسان (انسانوں) کی جبلت تغلب domineering کا بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا معاشی ضرورتوں سے ہوتی ہے جس کی خاطر آبادی کے مختلف طبقے باہمی تعاون اور ایک نظام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

ان معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے صناعتوں (صناعات) کا فروغ ہوتا ہے

صناعت کا تعلق فکر عملی تجربے سے ہے۔ اس طرح جب معاشی فارغ ا
اور ایک اجتماعی شخصیت کا ظہور ہوتا ہے تو اجتماع میں ایک طرح کی انا ابھر آئی
علامہ نے عصبیت رکھا ہے۔ یہ عصبیت اگر ایک طرف داخلی روحانی و جذباتی تشفّی
وسیلہ بنتی ہے تو دوسری طرف وسعت کا جذبہ اس سے ابھرتا ہے' اس تمنائے وسعت سے فتوحات کی آرزو پیدا ہوتی ہے' یہ وجہ ہے کہ عصبیت والے اجتماع بڑے سخت کوش محنتی اور نجیح ہوتے ہیں۔ تن آسانی' آرام پسندی اور عیش پرستی ان سے دور ہوتی ہے۔

یہ اپنی سخت کوشی کی وجہ سے شہروں کی آرام طلب حضارتوں پر غالب آجاتے ہیں اور انہیں مغلوب کر کے' اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ پھر یہ چکر چلتا رہتا ہے' یعنی یہی سخت کوش لوگ' عیش پسند بن کر کسی دوسرے سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

حضارت شہری طرز حیات کے خصائص میں نئے شہروں کی آبادی' عظیم عمارتوں اور مہیب قلعوں کی تعمیر اور علوم فائقہ کی وسعت و کثرت ہے۔ (اسی قسم کے خیالات مالنوسکی اور (BAGLY) نے بھی ظاہر کیے ہیں جن کا ذکر آچکا ہے' بہر حال حضارت رفتہ رفتہ آرام کوشی اور عیش پرستی میں بدلتی جاتی ہے۔ محض علوم کسی قوم کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتے نہ صناعت کی کثرت اسے بربادی سے روک سکتی ہے۔ قوموں کی زندگی کے لیے عصبیت کا وجود ضروری ہے' یعنی اس شعور (انا) کا جو قومی عروج کا اولین سرچشمہ ہوتا ہے۔ مغلوب اقوام جب کسی اور قوم کی نقالی کرتی ہیں تو اپنی عصبیت کھو بیٹھتی ہیں۔ علوم و فنون اگر اس عصبیت کی حفاظت کریں تو یہ برکت ہیں ورنہ یہی باعث نکبت و زوال بن جاتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک اصل شے عصبیت ہے' جو اقوام دنیا میں مقاصد (مشن) لے کر آتی ہیں ان کے علوم و آداب اور ان کے فنون و صناعات قوی اور توانا ہوتے ہیں۔ بے مقصد اقوام نفاست' ملامت اور آسودگی کی متمنی ہوتی ہیں۔

مباحث گزشتہ کا ماحصل

مذکورۂ بالا تصورات کی روسے اجتماع (افراد کا باہمی تعاون) انسان کی بقا کے لیے ضروری اور فطری ہے۔ لیکن اس بقائے باہمی کو مستحکم با اصول اور بامعنی بنانے کے لیے فرد کو دلی طور سے' رضامند اور آمادہ بنانا بنیادی ضرورت ہے تاکہ تعاون خوشدلی سے ہو۔ اور انسان ترقی کر کے کمال کی منزلیں طے کرتا جائے۔ اس مقصد کے لیے فرد کی اخلاقی تہذیب لازمی ہے۔

Marfat.com

یہ مقصد حکمت سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن چونکہ یہ مسئلہ عملی ہے اس لیے اسے حکمت عملی کے زمرے میں رکھا گیا ہے اور اس کی تنظیم کے لیے عقلی اور روحانی نظام تربیت تجویز کیا گیا ہے تاکہ داخلی دنیا میں نظم و ضبط اور آہنگ و موزونیت کا ذوق پیدا ہو جائے۔ یہی ذوق نتیجہ خیز اجتماعیت کا ضامن ہوتا ہے۔

بااصول اجتماعیت میں شرف کا ہونا ضروری ہے تاکہ جو کمال بھی حاصل ہو شرف کے ہمراہ ہو۔ شرف میں عدل اور ایثار و تقویٰ بنیادی چیزیں ہیں۔

اجتماع کا کمال یا اس کی غایت افراد کی فوز و فلاح' اور ان میں سے ہر ایک کو خیر اور سعادت کی دولت سے بہرہ ور کرنا ہے تاکہ وہ دوسروں کو بھی خیر و سعادت کی جملہ انواع (دینی' دنیوی' اخروی۔ داخلی اور خارجی) سے بہرہ ور کر سکیں۔ بس یہی اعلیٰ کلچر ہے۔

اس اعلیٰ کلچر میں بہت سے فضائل ابھر آتے ہیں جنہیں آج کل اصطلاح میں حسن کی صورتوں یا اقدار Values سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آخر میں یہ مدِنظر رہے کہ کلچر کی آزادانہ نشوونما کے لیے دو تین بنیادی پابندیاں بھی لازمی سمجھی گئی ہیں۔ مثلاً ضبط و تمکین (Restraint) تقویٰ Self-control اور عدل (جس کے دوسرے معنی دیانت اور انصاف ہیں' یعنی اپنے سے اور دوسروں سے مکمل انصاف و دیانت) مسلمانوں کے تصور کے کلچر میں' بے قید آزادی' افراط اور تفریط باعث اختلال ہیں نہ کہ علامت کمال۔ فقط۔

حوالہ جات

1. عام طور سے مسکویہ۔
2. وہ لوگ جن کی ملکی اور بہیمی قوتوں نے آپس میں مصالحت کر رکھی ہو۔
3. اصحاب تجاذب جو اس کش مکش کے لیے ریاضات شاقہ اختیار کرتے ہیں۔

تیسرا باب

اسلامی کلچر کی ماہیت

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ نظریے اور عقیدے سے متعلق تھا۔ اب بحث یہ آتی ہے کہ صدیوں تک ان نظریوں اور عقیدوں پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں نے جو معاشرہ پیدا کیا اور اس کے اندر سے جو کلچر نمودار ہوا اس کی خارجی صورت کیا تھی۔

لیکن پہلے اس سوال کا جواب لازمی ہے کہ اسلامی کلچر کی ترکیب کس حد تک جائز ہے؟ کیونکہ کہا یہ گیا ہے کہ کلچر اقوام کا ہوتا ہے عقیدوں کا نہیں ہوتا۔ جواباً عرض ہے کہ اگرچہ یہ مغالطہ لفظی ہے اور اسلامی کلچر سے مراد مسلم کلچر ہی ہے کیونکہ یہ فاعل پر فعل کا اطلاق ہے تاہم صحیح طریق اظہار شاید یہی ہوگا کہ اسے مسلم کلچر کہا جائے۔ لیکن اس لحاظ سے اسے اسلامی کہنا بھی غلط نہیں کہ مسلم تہذیب اسلام کے زیر اثر اسلام کے ماننے والوں نے پیدا کی لہٰذا اس میں فاعلی عنصر اسلام ہی ہے یہ اور بات ہے کہ اس کا ہر عنصر ضروری نہیں کہ اسلام کے راسخ عقیدوں کے مطابق ہو۔ انسانی عمل میں مکمل اور مثالی کو صرف فرض کیا جاتا ہے جو واقعہ میں ہوتا ہے وہ مثالی کی طرف ایک قدم ہوا کرتا ہے۔ فعل میں آنے کے دوران ہر شے کی شکل و صورت بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں نے عرب سے باہر نکل کر جب دوسری اقوام سے میل جول پیدا کیا تو قدرتی معاشرتی اثرات کی وجہ سے ایسے عناصر بھی ان کے کلچر میں شامل ہوگئے جن میں سے بعض اجزا اصلی اسلامی ہیئت سے یقیناً بیگانہ ہوں گے۔

بایں ہمہ یہ مسلم کلچر اسلامی عقیدوں کا گہرا نقش لیے ہوئے ہے' اس لیے اسے بالواسطہ اسلامی کلچر کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام عقیدہ ہے اور کلچر اس کا عمل' یہ موجود فی الخارج حقیقت کلچر کہلاتی ہے مگر یہ خارج' باطن سے بے نیاز نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عمل میں اصل عقیدے کا پورا پورا عکس نہ آیا ہو تاہم رعایتاً اگر اسے اسلامی کلچر کہتے ہیں تو اس سے مراد مسلمانوں کا کلچر ہی ہوتا ہے لہٰذا اس بارے میں موشگافی بیکار ہے۔

Marfat.com

اسلامی کلچر ایک خاص معاشرہ کی پیداوار ہے

مندرجۂ بالا تصریحات کے بعد یہ کہہ دینا آسان ہو گیا ہے کہ اسلامی کلچر ایک خاص معاشرے سے ابھرا جس کا آغاز اسلام کے ابتدائی کارکنوں اور علمبرداروں کی طرز زندگی سے ہوا۔ آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ اور صحابہؓ کے عمل و تعامل سے اس کے بنیادی نشانات قائم ہوئے۔ آنے والے مسلمانوں نے تقریباً ہر دور میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ کسی خاص معاملے میں آنحضرتؐ اور صحابہؓ کا تعامل کیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ تجسس ان کے تہذیبی مزاج کا ایک داخلی عنصر بن گیا۔ یہ اسلامی معاشرہ مسلمانوں کی سلطنتوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے ان سب خطوں میں پھیلتا گیا جو مسلمانوں کی سلطنت میں آتے گئے۔
مسلمانوں کا کلچر اپنے مزاج کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو خاص عناصر کا حامل تھا۔ اوّلاً یہ کہ اس کے مرکزی نقوش دین سے حاصل کیے گئے تھے اور دین اسلام عقائد و عبادات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ ایک مجلسی نظام اور طریق زندگی بھی تھا لہٰذا اس کلچر پر دین اسلام چار اطراف سے از ابتدا تا انتہا حاوی[1] رہا۔ لہٰذا اسلامی تمدن کی داخلی روح نمایاں طور پر دینی ہی رہی' دوم: یہ کلچر خالصتاً نسلی اور یک قومی نہ تھا بلکہ ایک ایسا معجون مرکب تھا جس میں دنیا کی بعض بڑی اقوام اور بڑی بڑی نسلوں نے حصہ لیا جو مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں بود و باش رکھتی تھیں۔ اس لیے اسلامی کلچر ایک معجون مرکب Complex اور مختلف[2] الاجزا کلچر بن گیا جس میں مقامی معاشرتوں کے وہ سب اجزا اور عناصر جذب کر لیے گئے جو دین کے بنیادی اعلانات کے منافی نہ تھے۔ اس لیے اس کی وسعت پذیری میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اگرچہ دین اسلام اور اس کے مبلغوں کو مختلف قوموں سے نباہ کرنے اور ان کے ناگوار تضادات کو رفع کر کے انہیں ایک کلچر اور ایک قوم میں تحلیل اور جذب کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا تاہم دین کی آفاقی روح نے شدید دینی حس کے بھروسے اقوام میں ایک تہذیبی وحدت پیدا کر ہی دی (ملاحظہ ہو بارٹولڈ XIX پروفیسر سہروردی)۔ غرض اس کلچر نے ہر مقامی تمدن سے استفادہ کیا۔ اگرچہ ہر موقعہ پر اس پر مہر اپنی ہی لگائی اور اس کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس لیے اسلامی کلچر کثرت میں وحدت[2] اور وحدت میں کثرت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اور اس میں وہ مشترک عنصر یقینی ہے جسے ہم اسلامی یا مسلم کہتے ہیں اور یہ نقش ہر مسلم ملک میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔

Marfat.com

مندرجہ بالا وجوہ سے اس کلچر کو اگر اسلامی کلچر بھی کہہ دیا گیا ہے' تو کوئی یہ نا قابل قبول بات نہیں کیونکہ اس کلچر پر اسلام کے عقائد کا جتنا اثر نظر آتا ہے اتنا دوسرے عناصر مثلاً نسلی اور پرانی تہذیبوں کے عوامل کا نہیں' دوسرے اثرات تو اجزا کی حیثیت سے اس میں شامل ہیں مگر ان اجزا پر ایک خاص رنگ چڑھا ہوا ہے جو محض مسلمان ہونے کی بنا پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے کلچر میں ہم دین اسلام کے بعض خاص عقائد کا خاص اثر موجود پاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کلچر میں دین سے انحراف اور کج روی کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ مگر انہیں جزوی اور استثنائی خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے کمزور اعمال و اشغال تھے مگر ان کے یہ برُے بھی باغی نہ تھے کجرو ہی تھے۔

اس کلچر میں جن عقاید عظیمہ نے قوت اور بقا کی صلاحیت پیدا کیے رکھی ان میں اہم ترین یہ عقیدہ تھا کہ دین اور دنیا ایک ہیں اور زندگی کی تطہیر (عمل صالح) اور تسخیر (جہاد) دین کے بنیادی اجزا ہیں۔ دین کی اس روح کو بعض غیر اسلامی افکار سے نقصان بھی پہنچتا رہا۔ مگر اصلی روح عام طور پر ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة (2البقرۃ:201) ہی بقا کا سامان پیدا کرتی رہی۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اسلامی کلچر کی بنیاد اصول حرکت پر ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا سارا نظام حرکی اور ارتقائی ہے۔ اور قرآن مجید نے اس معرفت کو مسلمانوں میں پھیلا کر انہیں ایک متحرک قوم بنایا۔ اس معرفت نے مسلمانوں کی عملی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔[3]

حرکت و ارتقا' تاریخ کا دوسرا نام ہے۔ مسلمانوں کی یہ تاریخیت (Belief in history) بے سبب نہ تھی۔ یہ عقیدۂ ارتقائے زندگی کا نتیجہ تھی۔ اور زندگی کے حادث ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے متغیر اور ترقی پذیر ہونے کا تصور اسلامی منطق کے ابتدائی اسباق میں تھا اور زندگی کے ترقی پذیر ہونے اور مکمل تر ہوئے جانے کا نظریہ مسلمان طبیعین کے علاوہ خود مسلمان صوفیوں کے نزدیک نہ صرف مسلم بلکہ بڑا مقبول رہا۔ چنانچہ کل یوم ھو فی شان (55الرحمٰن:29) کی توضیح و تشریح میں زندگی کی نت نئی شکلوں اور حسین تر رویوں کا تذکرہ تفسیروں میں بار بار آیا ہے۔ اس سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو علامہ اقبال نے نکالا ہے۔

Thus all lines of Muslim thought converge in a dynamic conception of the Universe

(خطبات ص176)

اس کلچر کی عمارت مذکورہ عقائد عظیمہ کی بنیاد پر قائم رہی مگر اسے قوی سے قوی تر

بنانے میں بعض دوسرے افکار قاہرہ (Dominant Ideas) بھی ہمیشہ کار فرما رہے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ دین اسلام دنیا کا مکمل ترین' غالب ترین اور آخری دین ہے چنانچہ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے:

(1) الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت بکم الاسلام دینا (5 (المائدہ) : 3)

(2) ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (48 (الفتح): 28)

اسی طرح یہ احساس کہ اسلام پر عمل کرنے والے مسلمان افضل ترین قوم ہیں اور خدا نے اس قوم کو دنیا کے لیے نمونہ اور تطہیر و تکمیل حیات کے لیے معیار نامزد کیا ہے۔

و کذالك جعلنکم امة وسطا لتکونو اشھدآء علی الناس (2 (البقرة): 143)

اسی طرح یہ احساس کہ قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور اس میں ہماری زندگی اور آخرت کے لیے سب کچھ موجود ہے اور یہ بھی کہ آنحضرتؐ انسانیت کا مکمل ترین نمونہ ہیں لہٰذا امہمات امور اور مشکلات زندگی میں حوالہ و مراجعت انہیں کی زندگی اور عمل کی طرف ہونا چاہیے۔ یہ احساسات مسلمانوں کی تمدنی اور دینی تنظیم میں ہمیشہ تعمیری اور تقویتی ممدات و معاونات کا کام دیتے رہے۔ اور یہ ایسے احساسات تھے جن کو دل میں لے کر مسلمان مشرق سے مغرب تک پھیل گئے اور بڑی بڑی تہذیبوں اور بڑی باجبروت سلطنتوں سے ٹکرا گئے۔ اور اس وقت ٹکرا گئے جب ان کی اپنی عام علمی حالت اور ان کے وسائل ظاہری بہت محدود تھے۔ صرف جذبۂ دینی اور یہ احساس کہ "ہم ہیں" ان کے لیے سرمایۂ قوت اور وسیلۂ تسخیر عالم ثابت ہوتا رہا۔ انہوں نے مادہ سے ہمیشہ کام لیا اور اس کی تسخیر بھی کی مگر وہ مادہ کے غلام کبھی نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک جذبہ مادے کا خالق اور اس کا متصرف ہے اور اس سے قوی تر ہے۔ کسی کلچر میں یہ بحث بھی اہم ہے کہ اس میں سب سے زیادہ زور کس بات پر دیا گیا ہے۔ اسلامی کلچر میں سب سے زیادہ زور حسن آفرینی اور لذت آفرینی پر نہیں بلکہ استکمال پر دیا جا رہا ہے۔ اور جیسا کہ پکتھال نے لکھا ہے اس نے انسان (انسانوں) کو زیادہ صفت کمال سے آراستہ کرنے بہ حیثیت انسان شریف بننے پر زور دیا ہے موصوف کے الفاظ قابلِ غور ہیں:

" The Culture of Islam aimed not at beautifying and refining the accessories of hunman life: it aimed at beautifying and exalting human life itself" (see the

Marfat.com

Cultural side of Islam, Sh Ashraf. Lahore, 1968. p. 3)

اس ضمن میں پکتھال نے اہل مغرب کے جنون فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ کے لوگ فن کے معاملے میں اتنے دیوانے ہوگئے ہیں کہ ان کی نظر میں انسان کو فن پر قربان کرنا جائز ہے۔ انسان کا اس کی جان کا' اس کے شرف کا مقام کسی بت یا مجسّمے کے مقابلے میں پست ہے' یورپ کے اخباروں میں مدتوں یہ بحث چلتی رہی کہ اگر کسی کمرے میں ایک بچہ ہو اور وہیں کوئی یونانی مجسمہ ہو تو کسے بچایا جائے' بچے کو یا مجسّمے کو؟ تو اکثر جواب یہ آئے گا کہ مجسّمے کو۔ کیونکہ بچے تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مجسمہ پھر نہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ فن کی تکریم نہیں جنون فن ہے۔ انسان ہر حال میں مقدم ہے۔ پکتھال نے لکھا ہے کہ اسلام بجا طور سے فن کو انسان کے مقابلے میں اتنے احترام کا مستحق نہیں سمجھتا انسان اول ہے فن ثانوی ہے۔

ان گزارشات کے بعد غالباً اس امر کی تصریح کی ضرورت نہیں کہ اسلامی کلچر (یا مسلمانی کلچر) کے مرکزی نقوش ایک خاص طرز احساس' ایک خاص طرز فکر' ایک خاص طرز زندگی اور ایک خاص مجلسی نظام سے مرتب ہوئے۔ جن کی بنیاد قرآن مجید کے ارشادات اور حضرت رسول کریمؐ کی طرزِ زندگی پر رکھی گئی۔ ابتدا میں اس کلچر کا سادہ ہونا ظاہر ہے مگر رفتہ رفتہ زندگی کی وسیع تر ضرورتوں کے رنگ اس کے سادہ خاکے میں داخل ہوتے گئے۔ جن میں سے بعض دین کی اصلی روح سے الگ بلکہ بیگانہ بھی تھے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ کلچر کا اصلی مزاج اکثر ان عناصر سے آگاہ ہو کر ان کے خلاف نبرد آزما ہوتا رہا۔ اس کلچر میں سب سے زیادہ باغی عنصر خارجی اقوام کی معاشرت اور سلاطین و امراء کی مطلق العنانی بھی تھی جس نے ایسے طرز سلطنت کو رواج دیا جو خلافت راشدہ سے بالکل مختلف تھا' مگر چونکہ یہ کلچر اصولاً شروع سے متاثر رہا ہے اس لیے اس کو سند عام طور پر بادشاہوں کے ہاتھ میں نہ تھی بلکہ عامتہ المسلمین کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار میں علما اور عوام کی قوت اتنی مسلم اور غالب رہی ہے کہ درباروں اور سلطنتوں کو بھی اپنے اطوار میں (کم از کم اپنی جلوتوں میں) ظواہر کا پابند (Formal) رہنا پڑتا تھا ورنہ مسلمانوں کا عام طبقہ ان کی زندگی اور طریق حیات پر انگشت نما ہونے سے گریز نہ کرتا تھا۔ اور تاریخ کی خارجی اور اس سے زیادہ اس کی داخلی شہادتیں اس حقیقت کا بار بار اعلان کرتی ہیں کہ وہ سلاطین اور بادشاہ مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکتے تھے جن کی زندگی میں دین کے واضح اعلانات کے خلاف کھلے باغیانہ اعمال پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کلچر عام طور پر عام اور متوسط درجے کے مسلمان شہریوں کا

کلچر تھا جس میں دیہات اور شہروں کے فاصلے مٹ گئے تھے۔ اس میں ثروت ودولت کو اہمیت تو ضرور ملتی رہی اور سلاطین کا جبر واقتدار بعض غیر معتدل مظاہر کا ذمہ دار بھی ہوتا رہا مگر جمہور میں دین کے سکھائے ہوئے آداب کا احترام ہمیشہ غالب رہا۔ انحراف کا دائرہ بعض درباروں یا چند خانقاہوں تک محدود رہا مگر یہ کھلی باغیانہ لہریں عموماً جمہور کے لیے ناپسندیدہ رہیں۔ علما اور صوفیہ شہروں سے زیادہ' دیہات میں اپنے مدرسے اور خانقاہیں قائم کرتے تھے مگر شہروں میں بھی ہوتے تھے اس سے ایک طرح کی یکسانی نمودار ہوئی۔

کسی کلچر کا پہلا اہم مسئلہ طرز زندگی ہے۔ یہ بڑی وسیع اور پیچیدہ اصطلاح ہے لہٰذا اس خاص بحث میں اسلام کو راسخ اور اصولی تصور زندگی اور مسلمانوں کے عملی طرز زندگی میں فرق کرنے کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں کا ہر فعل اور طریقہ لازماً اسلامی ہو۔ اس کے برعکس یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مسلمانوں کا ہر عمل لازماً غیر اسلامی ہو (جیسا کہ مستشرقین باور کراتے رہتے ہیں) ان دو پوزیشنوں کے درمیانی فاصلے بہت ہیں اور ان میں معاشرت کے عجیب وغریب تنوعات ملتے ہیں جو مختلف جغرافیائی اور نسلی اثرات کے سبب بڑا تنوع رکھتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں باہر کی کچھ حدیں ضرور قائم کی جاسکتی ہیں' مثلاً اول: مسلمانوں کے معین پرسنل لا کی وجہ سے مجلسی روابط کا ایک مرکزی خاکہ ہر جگہ موجود رہا یا اس پر اصرار کیا جاتا رہا؛ دوم: قرآن مجید اور آنحضرتؐ کے پیش کردہ واضح آداب کا ہمیشہ احترام ملحوظ رہا۔ اس طرح اگرچہ معاشرت کی جزئیات مقامی رہیں مگر معاشرت کا مزاج اور رجحان عموماً دینی ہی رہا (ملاحظہ ہو مارمڈیوک پکتھال: The Cultueal Side of Islam طبع لاہور؛ ایم اے حنفی: A Survival of Muslim Institution and Culture طبع لاہور)

طرز زندگی کے خارجی مظاہر میں نمایاں چیز لباس ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں مختلف ممالک میں لباس کی رنگارنگی کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ اس پر کوئی قید کبھی نہیں لگائی گئی۔ مگر ہاں یہ احتیاطیں ہر جگہ ملتی ہیں کہ لباس پاک ہو (کیونکہ عام نفاست کے علاوہ بھی طہارت ضروری ہے) وہ لباس جو عبادات میں مخل ہو اسے ناپسند کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں لباس کے ان طریقوں کے خلاف اکثر ناگواری کا اظہار کیا گیا جو نمایاں طور پر عیسائیوں' یہودیوں اور ہندوؤں سے مخصوص تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے تشخص اور انفرادیت کا تحفظ تھا۔ کھانے پینے کے متعلق بھی یہی پابندیاں تھیں' مثلاً کھانا پاک ہو' حلال ذرائع سے کمایا گیا ہو' نشہ آور نہ ہو' شراب اور خنزیر اور مردہ گوشت ممنوع رہا۔ رزق کا احترام

Marfat.com

مسلمانوں میں اب تک موجود ہے' جہاں مغربی اثرات کم ہیں وہاں اب بھی لوگ زمین پر گرے ہوئے دانہ گندم وجو یا ریزہ نان کو زمین سے اٹھا کر اونچی جگہ رکھ دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں شراب پینے والے ہر دور میں موجود رہے مگر شراب پینے والے بُرے ہی سمجھے جاتے تھے۔ اچھے نہیں خیال کیے جاتے تھے۔

مغربی اثر سے پہلے کی اسلامی تاریخ مرد و زن کے بے محابا اختلاط اور عام مجلسی میل جول کی مثالوں سے تقریباً خالی ہے۔ نقاب و حجاب کے بارے میں ہر دور میں عمل مختلف رہا لیکن حجاب و نقاب کا مقصد (حیاداری کا خیال) ہمیشہ مدِنظر رہا۔ اسی رعایت سے عورتوں کے لیے پردہ داری عمارتوں کا رواج رہا ہے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر آزاد مخلوط مجلسی سرگرمیوں کا حال تاریخوں میں کم ہی ملتا ہے۔ قرابت داری اور خاندانی زندگی میں بھی رکھ رکھاؤ پر عمل تھا۔ مجلسی و منزلی آداب کے بارے میں آنحضرتؐ کے شمائل کے تتبع میں ایک ضابطہ اخلاق وضع ہوتا گیا جس کو ابن مسکویہ' امام غزالی اور دوسرے معلمین اخلاق نے اپنی اپنی تصانیف میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس میں سلام و خیر مقدم' مشایعت' آداب طعام' مجلسی گفتگو' نشست و برخاست' بزرگوں کے تقدم اور احترام کے آداب درج ہیں۔ اور شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ان پر ہمیشہ عمل ہوتا رہا۔ گویا معیار بندی (Standardization) کے ذریعے مسلمانی طرز زندگی کا ایک معیار (Standard) وجود میں آگیا تھا۔ بعض اوقات انتہا پسندی کی وجہ سے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی جاتا رہا مگر قرآن اور آنحضرتؐ کے نمونے کی طرف رجوع (Reference Bool) سے عموماً اس کی اصلاح ہو جاتی رہی چنانچہ ہر دور میں احیائے سنت اور ردّ بدعت کی تحریکیں اٹھتی رہیں۔

مسلمانوں کے دوسرے معاملات (مثلاً خرید و فروخت' معاہدا و مواثیق اور داد وستد وغیرہ) میں بھی مقامی اختلافات کے ساتھ یہ احتیاط ملحوظ رہتی تھی کہ کوئی چیز اُسوۂ رسولؐ کے منافی نہ ہو' یا اس کے لیے درجہ چیلنج کا نہ رکھتی ہو' یا ایسی نہ ہو جس سے اسلامی زندگی کے اصل مقصد (طہارت زندگی) پر زد پڑتی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مسلمانوں کی ساری زندگی قرآن و حدیث کے مطابق تھی۔ مگر مقبول ترین سانچا یہی تھا' جس کو اعلیٰ اُسوۂ حیات کی تلاش ہوتی تھی وہ اس مسلک کی پیروی کی کوشش کرتا تھا۔ سود کی ممانعت مسلم ہے چنانچہ اس کا اثر مسلمانوں کے طریق تجارت پر بھی ہوا اور یہ واضح ہے کہ اصل نفع روپیہ پر نہیں محنت اور کوشش پر ہے۔ بیع سلم کی ممانعت نے تجارتی سفروں کو بہت رواج دیا۔ سیر و شکار اور فوجی زندگی نے جسمانی ورزشوں کے علاوہ

گھوڑوں، بیلوں، اونٹوں اور ہاتھیوں اور خچروں کی تربیت کے مواقع پیدا کیے۔ آداب حرب میں تیغ زنی، نیزہ بازی وغیرہ وغیرہ کا خاص ذوق پیدا کیا۔ فوجی زندگی نے جیوش کی تنظیم کی ضرورت کا احساس دلایا۔ چنانچہ فوجی آداب، نظام، لباس اور نقل و حرکت کے قاعدے مسلمانوں ہی نے دنیا کو دیئے (ملاحظہ ہو، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ جیش)

میں نے ابھی ابھی معیار بندی (Standardization) کا ذکر کیا ہے..... یوں تو ہر کلچر قومی وحدت و تنظیم کی خاطر ایک خاص ہیئت (Form) پر اصرار کرتا ہے مگر اسلامی کلچر نے چند مشترک شرعی امور کے سوا کسی مخصوص فارم کا پابند نہیں بنایا۔ تاہم مسلمانوں کے خاص طرز فکر اور خاص اسلوب حیات کے باعث یا روابط باہمی کے باعث بعض خاص نقوش خاص زمانوں میں مسلمانی کلچر کا جز یا اس سے وابستہ خیال کر لیے گئے تھے جن کا ہمیشہ احترام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان میں بعض کا احترام آج بھی قائم ہے۔ مثلاً نماز کے لیے حسب توفیق باوقار لباس، پردہ داری، ایک خاص طرز عمارت، ایک خاص دستور اخلاق اور آداب کے علاوہ بعض نشانات و مظاہر، مثلاً تسبیح، عصا، طیلسان، خرقہ و عبا کہ یہ سب مسلمانوں سے وابستہ علامات بن گئیں...... ان سے انکار لازماً غیر اسلامی فعل نہیں مگر مسلمانوں کے مخصوص عوامل زندگی سے بدظنی کا آئینہ دار ضرور ہے۔ اس معیار (Standard) اور مخصوص فارم کی یہ صورتیں آج دنیا میں کم سے کم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ دوسری غیر ملکی یورپین چیزوں نے لے لی ہے۔ مگر یہی وہ چیزیں تھیں جن سے مسلمان دوسری اقوام و مذاہب سے الگ پہچانے جاتے تھے۔ یہ تعارفی مخصوص نشان، قوموں کے تشخص کے لیے ضروری ہوتے تھے۔ کسی الگ کلچر کی مدعی قومیں جب ایسے نشانات (شعائر) کو ترک کر دیتی ہیں تو وہ اپنی انفرادیت (اور نتیجتاً عظمت) کھو بیٹھتی ہیں...... وہ دوسروں کے شعائر اختیار کر کے اپنے زعم میں معزز بن جاتی ہیں مگر در حقیقت، وہ غلامی کا طوق زریں پہن کر نازاں ہوتی ہیں کہ وہ بلند مقام پر ہیں مگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ قومی عزت و وقار سے محروم بندۂ غیر ہوتی ہیں، انہیں زیب نہیں دیتا کہ کسی غیر کے کلچر کو اپنا کر یہ دعویٰ کریں کہ ان کا بھی کوئی کلچر ہے۔

حوالہ جات

1۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ سو فیصدی دین کے مطابق تھا۔

ایسا نہیں ہوا اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ مگر مجموعی لحاظ سے جب کسی کو فیصلے کی ضرورت محسوس ہوئی تو فیصلہ دین ہی سے حاصل کیا گیا۔ پروفیسر سہروردی نے بارتولڈ کی کتاب "مسلمان کلچر" کے دیباچے میں اس نکتے پر زور دیا ہے کہ اسلام میں عقیدہ رکھنے کی وجہ سے مسلمان کلچر میں وحدت اور یک رنگی پیدا ہوئی اور قوموں کے اختلاف کے باوجود اسلام نے سب میں نمایاں مشترک خصوصیات پیدا کیں (بارتولڈ کی مذکورہ کتاب 'ص 8) نیز مماڈ یوک پکھتال کی کتاب Cultural side of Islam طبع' شیخ محمد اشرف لاہور' 1969ء (بار سوم) ص 2۔

2 تفصیل کے لیے دیکھیے (GRUNBEUM) کی مرتب کردہ کتاب (Unity and Variety in Islamic Civilization) اس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ احتیاط ملحوظ رہے کہ ان مصنفین کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی کلچر کوئی شے نہیں یہ کوئی علاقائی کلچروں کا ملغوبہ ہے۔

3 اس موضوع پر ملاحظہ ہو مظہر الدین صدیقی کی کتاب Concept of Muslim Culture in Iqbal

Marfat.com

چوتھا باب

مسلمانوں کے فنون لطیفہ

اس مختصر کتاب میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ کی پوری سرگزشت بیان نہیں کی جا سکتی۔ فنون اسلامی کی تاریخ کیلئے متعلقہ انواع فن کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں مجھے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کے فنون' ان کے عقائد مذہبی سے متاثر ہوئے۔

مستشرقین اسلامی فنون کے سلسلے میں بیک وقت دو متضاد پوزیشنیں اختیار کرتے نظر آتے ہیں ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی خاص فن نہ تھا انہوں نے جو کچھ کیا یا ان کی طرف جو کچھ منسوب ہے وہ یا تو مشرقی مسیحی (قبطی رومی) اثرات کا نتیجہ ہے یا ساسانی اثرات کا۔ فن تعمیر کے سلسلے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ بنوامیہ اور بنو عباس کے زمانے کی تعمیرات میں بوزنطی' رومی' قبطی اور ایرانی کاریگروں کا فن اور ہنر جلوہ گر ہے کیونکہ عمارتیں بنانے کیلئے ان ممالک سے کاریگر بلائے جاتے تھے۔

ڈیمنڈ نے اپنی کتاب "مسلمانوں کے فنون" میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے ہاں' اپنا کوئی آرٹ نہ تھا لیکن شام' عراق' مصر اور ایران کی تسخیر کے بعد انہوں نے ان فنون کو اختیار کیا جو ان ملکوں میں ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچ چکے تھے۔"

(اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ' ص 21)۔

اس قسم کی باتوں سے دانستہ یا نادانستہ مغالطہ انگیزی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے "عربوں" سے کیا مراد ہے؟ محض مکہ یا مدینہ کے یا حجاز کے؟ یا اس لفظ میں وہ سب عرب شامل ہیں جو جزیرۃ العرب میں رہتے تھے اگر جزیرۃ العرب مراد ہے تو کیا اس جزیرے میں شام' یمن' حیرہ اور عراق شامل نہ تھے؟ اور یہ معلوم ہے کہ ان علاقوں میں' ان کی حضارت کے دور عروج میں' مخصوص قسم کے فنون (فن تعمیر

Marfat.com

وغیرہ) کو عروج حاصل ہوا۔ اگر مصنف صرف یہ کہتا مکہ حجاز اور قریش میں کوئی فن موجود نہ تھا تو شاید یہ درست ہوتا اگرچہ درست یہ بھی نہیں کیونکہ قریش میں (اور حجاز میں) فن شاعری اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ سبعہ معلقہ کا وجود اس دور کی شاعری پر شاہد عادل ہے۔ تاہم بدویت تسلیم کی جاسکتی ہے مگر سارا عرب اس میں شامل نہیں سمجھا جاسکتا۔

غرض ایک طرف تو یہ پوزیشن لی جارہی ہے کہ عربوں کے ہاں فنون کی قسم کی کوئی شے نہ تھی یہ سب باہر کے لوگوں کا مال ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے فنون تھے تو سہی مگر درجہ کمال کو نہیں پہنچ سکے۔ حالانکہ جب عربوں کا (اور مسلمانوں کا) اس میں حصہ ہی کم سے کم ہے اور یہ ایرانیوں' قبطیوں' بوزنطیوں اور رومیوں کا کیا دھرا ہے تو پھر کہنا یہ چاہیے کہ مسلمانوں کے دور میں مذکورہ اقوام کا پیدا کردہ فن ناقص تھا مسلمانوں کا (یا اسلام کا) ذکر ہی کیوں آئے۔

لیکن ہم تاریخی وجوہ سے ڈیمنڈ اور دوسرے فن شناسوں کی کسی پوزیشن کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

اثرات کا سلسلہ' پوری انسانی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ استفادہ' توریث اور اثر پذیری جملہ تہذیبی معاملات کا قانون مسلم ہے...... 'ان کے معاملے میں آج تک نہ کوئی دیوار چین کھڑی ہوئی نہ ایسی کسی دیوار چین کا کچھ فائدہ ہوا' تہذیب اور فن' ہواؤں کے مانند ایک خطے سے دوسرے خطے تک بلا تکلف' کسی پاسپورٹ کے بغیر داخل ہو جاتے ہیں اور یہ پوری نسل انسانی کا ماجرا ہے۔ لہٰذا یہ بحث بے محل ہے کہ کونسا اثر کہاں سے آیا۔ دیکھنے کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو بنی نوع انسان کا جو ورثہ ملا اس سے انہوں نے کیا سلوک کیا اس میں کیا اضافہ ہوا اور اس پر ان کے ذہن و ذوق اور عقائد کا کیا اثر پڑا۔ فقط!

مسلمانوں کے فنون متعدد ہیں۔ بعض ان میں سے خصوصی توجہ کے مستحق قرار پائے' بعض کی طرف ثانوی توجہ ہوئی اور بعض تقریباً مسترد کر دیئے گئے۔ ان تینوں رویوں کی ذمہ داری ان کے عقائد پر ہے اور اس ذمے داری کو قبول کرنے میں مسلم ذہن و ذوق کو شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے مرغوب ترین فنون علم (کتاب) مسجد (عبادت) اور جہاد (برج و حصار و قلعہ) سے متعلق ہیں' ان کی خطاطی' مصوری و نقاشی کا تعلق کتاب' مسجد اور قلعہ سے ہے۔ اور ان میں سے دو کا تعلق فن تعمیر سے ہے۔ اور یہی مسلمانوں کا سب سے بڑا فن ہے۔ ان معنوں میں ان کے فنون علمی اور مقصدی تھے' ان سے بے غرض راحت' یا محض تفریح

Marfat.com

مقصود نہ تھی۔ ان کا نغمہ بھی دراصل ترفع انسان کا مقصد لیے ہوئے ہے۔ خط برائے خط اس کا مقصود نہیں...... باقی آرائشی و آسائشی فنون' مثلاً پارچہ بافی' ظروف سازی' کندہ کاری' فلزکاری' قالین بافی' سکہ سازی وغیرہ وغیرہ تو صناعات میں سے ہیں کہ جن کا پہلا مقصد صراحتاً عملی ہے۔ آرائش وزیبائش ان کا صرف دوسرا مقصد ہے۔

اب قابل بحث سوال یہ ہیں:

1۔ کیا فن کا یہ تصور اور عمل کسی اعلیٰ کلچر کے تقاضوں کے منافی ہے؟

2۔ جن اقوام کا یہ تصور نہیں کیا ان کا کلچر ناقص ہے؟

3۔ کیا اس تصور فن کے آج کے دور میں کچھ امکانات ہیں؟

میں اس مختصر رسالے میں ان سوالوں کا مفصل جواب نہیں دے سکتا۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ فن کسی ایک قوم اور کسی ایک نظریے میں مقید نہیں' فن از بسکہ اظہار کا نام ہے اور اظہار کی راہیں اور صورتیں لاانتہا ہوں اس لیے کسی ایک طرز یا احساس یا نقطۂ نظر کو فن سمجھنا اور باقی کو خارج از فن یا خلاف فن کہہ دینا ہرگز درست نہیں۔

آج کے مغربی اور مشرق کے جدید نقادان فن کی یہ کم فہمی ہے کہ وہ اظہار کو صرف مغربی معیاروں سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو فن ان کے مطابق نہیں اسے کمتر سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کا نظریۂ فن ان سے مخصوص ہے وہ مغربیوں کے نظریے کی طرح ایک منفرد نظریہ ہے' اسے کمتر یا کہتر کہنا نادانی ہے۔

یہ بھی المیہ ہے کہ کوئی اس نظریۂ فن کی مفیدیت' مقصدیت یا اجتماعیت......' یا عقیدے سے متعلق ہونے کو' اس کی کمتری کی علامت سمجھے۔

لہٰذا یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے فن کی خصوصیات جداگانہ ہیں مگر ان کی بنا پر' مسلمانوں کو کند ذوق یا فن کا مخالف کہنا کسی طرح درست نہیں۔

مسلمانوں کا فن ان کے نظریۂ زندگی کے تابع ہے' اور نظریۂ زندگی عقائد سے متاثر۔

آج کل جو فن مسلم ممالک میں رواج پذیر ہیں انہیں بڑی حد تک مغربی فنون کی پیروی کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ مغربی نظریۂ زندگی و تصور فن سے متاثر ہیں' البتہ جب ان میں مسلمانوں کے مخصوص عقیدے کام کرنے لگیں گے تو ان فنون کی منفرد مسلم شخصیت نمودار ہوگی۔

Marfat.com

پانچواں باب

مسلم کلچر میں خوشدلی کی لہر

السنۂ شرقیہ میں فکاہی ادب کا سرمایہ اچھا خاصا ہے مگر مذاق کی تبدیلی کو کیا کہیے کہ اس فکاہی ادب کی صحیح تشخیص نہیں کی جاتی اور بعض اوقات تو سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے' دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جس کے لوگ ہنسی یا تبسم سے ناآشنا ہوں گے۔ اس دولت سے ہر فرد بشر اور ہر انسانی اجتماع کم یا بیش لازماً بہرہ مند ہوتا ہے پھر یہ کیوں باور کر لیا جائے کہ عرب' یا ترک' یا تورانی' یا ہندی' یا ایرانی اس سے بطور خاص محروم رہے ہوں گے۔ مگر جدید دور میں پچھلے ادبوں یا معاشرتوں کا ذکر کرتے وقت عموماً یہ غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ لوگ ان ادبوں کو دوسرے ادبوں کے پیمانے سے ناپنے لگ جاتے ہیں اور خالص مغربی پس منظر میں دیکھ کر عجیب عجیب نتیجے نکالتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ہے کہ پرانے ادبوں کے مطالعہ پر فرصت کا پورا وقت صرف نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ یہ ادب بہت وسیع ہیں اور ان کے پس منظر میں جو تہذیب و تاریخ ہے وہ بھی کثیر الاطراف اور متنوع ہے اور اس کا صحیح مطالعہ تبھی ممکن ہے کہ اس پر عمر کا معقول حصہ صرف کیا جائے اور پھر غور و فکر اور دل جمعی سے اس کے درخشاں اور تاریک پہلوؤں پر رائے زنی کی جائے۔

اس سلسلے میں ایک بات تو واضح ہے کہ مغربی ادبوں کا اور مغربی تمدن و معاشرت کا مزاج مشرقی ادبوں کے مزاج سے اگر متضاد نہیں تو مختلف ضرور ہے۔ اس کے علاوہ واقعات تاریخ نے مختلف ادوار میں ان ملکوں کی اجتماعی تہذیب کو جس طرح متاثر کیا وہ نوعیت اور اثر کے لحاظ سے مشرق کے تجربوں سے ہمیشہ نہیں تو بسا اوقات ضرور مختلف رہی ہے' اس لیے صرف مغرب کے اجتماعی تجربات کی روشنی میں مشرقی احوال کی سراغ رسانی غیر تسلی بخش طریق کار ہوگا۔ مغرب کی ادبی اصناف ایک خاص اجتماعی ماحول اور ایک خاص پس منظر رکھتی ہیں' لہٰذا یہ اعتراض کہ مشرق کی عام ادبی اصناف مغرب کی طرح کیوں نہیں

Marfat.com

خاصا غیر منصفانہ اعتراض ہے۔ پس ان معاملات میں صحیح طریق کار یہ نہیں کہ مشرقی ادبیات کو محض مغرب کے پیمانے سے ناپا جائے یا اس معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث ان کو مذموم یا کمتر خیال کر لیا جائے بلکہ صحیح یہ ہو گا کہ ان کو اپنے ماحول میں دیکھ کر ان کے خصائص امتیازی کا پتہ چلایا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ ان کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس موقع پر ایک سوال نہایت اہم ہے۔ کیا کوئی ایسی شے بھی جس کو اسلامی ظرافت یا اسلامی روح ظرافت سے تعبیر کیا جا سکے؟ اسلامی ظرافت۔ یہ ترکیب ہی خاصی غرابت انگیز ہے مگر اس سوال کو اگر یوں بدل دیا جائے کہ ظرافت کے متعلق اسلام کا رویہ کیا ہے۔ تو موضوع بہت نتیجہ خیز بن جاتا ہے اس ضمن میں اولین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ظرافت کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ اور اس کی کیا حد مقرر کی ہے؟ یہ سوالات بڑے بر محل اور موزوں ہیں' محض اسلامی ظرافت کا عنوان قدرے تشویش انگیز ہو گا۔ کیونکہ مسلمان اقوام کے ادبوں میں ظرافت کا جو رنگ پایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اسلام کے ابھارے ہوئے اخلاق اجتماعی کے بھی مطابق ہو' یا ہر جگہ یکساں ریک رنگ ہو۔ تاہم اگر اسلامی ظرافت کی اصطلاح استعمال کر بھی لی جائے تو اس کی داستان بھی کم و بیش اسلامی تہذیب کی سرگزشت کی طرح ہے۔ جس طرح اسلامی تہذیب سے مراد مسلمان اقوام کی تہذیب ہے اسی طرح اسلامی ظرافت سے مراد مسلمان اقوام کی ظرافت ہے۔ لہٰذا اسلامی ظرافت کی کہانی دراصل عربوں کی ظرافت' ایرانیوں کی ظرافت' ترکوں کی ظرافت' غرض اس طرح کی جملہ اقوام کی ظرافت کی کہانی ہو گی جو اسلام کے حلقے میں داخل ہوئیں۔ البتہ یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان مقامی رنگوں پر زندگی کے اس نظریے کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہو گا جو اسلام نے ان اقوام کو دیا یا فکر و ذوق کے ان مسلکوں اور مشربوں نے جو روح اسلامی کے اندر سے پیدا ہوئے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ایسی یک جزو روح ظرافت کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس کو خالصتاً اسلامی ظرافت کے نام سے یاد کیا جا سکے۔ البتہ مخصوص قبائلی اور علاقائی رنگ ہائے ظرافت کے اندر ایک ہلکی سی لکیر ایسی ضرور نظر آتی ہے جس کو اسلامی ذوق ظرافت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کی جزئیات کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے مگر عموماً یہ لکیر نہایت باریک ہے جو بعض اوقات مدہم ہو کر گویا بٹ بھی گئی ہے۔ دراصل اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی مشکل یہی رہی ہے کہ اس کو قدم قدم پر نئی قبائلی اور علاقائی عصبیتوں سے واسطہ پڑتا رہا جن کو جذب کرنے میں روح اسلامی کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس لحاظ سے یہ سارا مضمون علاقائی یا قبائلی رنگ ہائے ظرافت پر مرکوز ہو جاتا ہے

Marfat.com

مگران علاقائی رنگوں کی تفصیل سے پہلے آیئے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ظرافت کے متعلق خود اسلام کا رویہ کیا ہے؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام کی نظر میں زندگی ایک فریضہ اور جہاد ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کی زندگی کو مسلسل سعی اور پیہم جدوجہد ہونا چاہیے مگر اس کے باوجود اسلام نے انسان کی ذوقی ضرورتوں سے جن میں خوش طبعی بھی شامل ہے) کہیں انکار نہیں کیا۔ بلکہ ان ذوقی ضرورتوں کو زندگی کے ضروری پروگرام میں شامل کیا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار انعام ربانی اور دنیوی نعمتوں کا ذکر آیا ہے اور بہشت کے متعلق جو ذوقی تصور دیا گیا ہے وہ جہاد زندگی کو خوشگوار معجون بنا رہا ہے۔ عورت اور مرد کی ضرورتیں جنسی اور حیاتیاتی نوعیت کی بھی ہیں اور ذوقی نوعیت کی بھی'...... اسی طرح کھانے پینے' لباس اور دیگر معاملات میں ذوق کی رعایتوں کو بڑی حد تک ابھارا گیا۔ خوشبو' رنگ' زیور' اچھا لباس عورت کیلئے ضروری ہے۔ ان سب امور میں ذوق کی پاسداری موجود ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نظریۂ جہاد کے باوجود ہے جو ہر مسلمان کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اسلامی زندگی میں جہاں خوف خدا اور خوف عقبٰی موجود ہے وہاں حزن و خوف اور غم و الم کی ممانعت بھی ہے۔ بلکہ مومنوں کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (2البقرۃ:112) اس سے اس طرز حیات کی نفی ہوتی ہے جس میں ہر وقت غم زدہ رہنا ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے لغو گفتگو اور واہی تباہی بکنے کو بہت برا قرار دیا ہے۔ اور قول سدید' کی تاکید کی ہے مگر یہ "قول سدید" خشک اور عبوس ہونے کا نام نہیں۔ مسلمانوں کے نظریۂ حیات میں خشکی اور عبوست شاید بیرونی اثرات کی آمیزش ہے۔

آنخضرتؐ کے سوانح نگاروں نے (احادیث صحیح کی سند سے) لکھا ہے کہ آنخضرتؐ مطائبہ کو پسند کیا کرتے تھے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يمزح ولا يقول الا حقا

ترجمہ: آنخضرتؐ مزاح کیا کرتے تھے مگر مزاح کی بات سچائی پر مبنی ہوا کرتی تھی،

ظاہر ہے کہ اسوۂ رسول کا یہ رنگ صحابہؓ کے یہاں بھی مقبول ہوا ہوگا۔ زندگی میں عمل کے شدید تقاضوں کے باوجود طبیعت کی یہ لچک جو ناگزیر بھی ہے۔ ابتدائی زمانے کے مسلمانوں نے روا رکھی ہوگی۔ اور تفریح اور زندہ دلی کی حوصلہ شکنی کا رواج مسلمانوں میں اگر پیدا بھی ہوا ہوگا۔ اگر آج کوئی یہ سوال کرے کہ مزاح کا اسلامی تصور کبھی ترقی پذیر ہوتا تو اس کے عناصر کیا ہوتے۔ تو شاید اس کی نشاندہی یوں ہوتی کہ اسلام میں مزاح کے ساتھ سچائی لازم و ملزوم ہے۔ لفظوں میں بھی اور واقعات میں بھی۔ کوئی صحیح اسلامی مزاح نگار ان

Marfat.com

غیر متوقع اور متقلب صورتوں سے مزاح پیدا کرتا جو سچائی اور حقیقت کے خلاف ہیں مگر اس کا کام صرف ہنسی ابھارنا ہوتا بلکہ بے ڈھنگی چیزوں کا تصور دلا کر ذہن کو پھر راستی کی طرف لانا ہوتا۔ بہر صورت خوش طبعی کا عنصر اس میں ضرور ہوتا۔ اسلامی مزاح کی کہانی قوموں کے مزاح کی کہانی بن کر رہ گئی۔ اس پر یہ ہوا کہ زہد و درع کے ایرانی اور عیسوی تصورات اسلامی تعلیم کے ساتھ گھل مل گئے ہوں گے۔ اس سے مزاح کی ترقی گوناگوں تغیرات کی اماج گاہ بن گئی۔ اور عربوں کی عمل سپرٹ اور واقعات ذوق پر ایرانی نزاکتوں اور داخلیت کے پردے پڑ گئے۔ اسی سے شاید ڈرامائی حرکت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غنیمت ہے کہ یہ زاہدانہ روش صرف ایک مختصر طبقے تک ہی محدود رہی۔ اور زندہ دلی کا رویہ بعض قیدوں کے باوجود ایک عام اجتماعی رویہ بنا رہا۔ جیسا کہ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جو قدرے بعد کے زمانے میں مرتب ہوئیں مگر جس میں اس ابتدائی زمانے کے مزاح و مطالبہ کے نمونے اور واقعات منقول ہیں۔

مزاحیات پر اس قسم کا مواد ایک تو ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں ہے اور کچھ اخبار سیبویہ المصری (ابن زلا متوفی 386ھ) میں ہے۔ الفہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن الندیم کے زمانے تک ظرافت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں صرفیوں اور نحویوں کے نوادر بھی شامل ہیں چنانچہ تقریباً ہر بڑے نحوی نے نوادر کے نام سے حکایتیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ الفہرست میں بطّال (Buffoons) کے متعلق کتابوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے[1] ان کے علاوہ حمقا کی کہانیاں۔ مغلوں کی کہانیاں' نجیلوں کی کہانیاں حظ کی کتاب الجلا۔ وغیرہ بھی ہیں۔ (ابن الجوزی کی کتاب الحمقا دا لمغفلین)

ابن بابا نے ظریفوں کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس سے ظرافت کے پرانے مواد پر اور بھی روشنی پڑتی ہے۔ القلقشندی جو بہت بعد کا مصنف ہے وہ بھی ظریفوں کے متعلق ہمیں معلومات بہم پہنچاتا ہے جس سے اسلام کے ابتدائی ادوار میں ظرافت کے رواج یا نوعیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

صدر اسلام کے عربی ادب کے نمونوں میں Humanism کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے' یعنی انسان اور اس کے ماحول سے مضحک صورتوں کی تلاش۔ اس زمانے کا عام عربی ادب (Humanistic) ہے اور انسان اور اس کے ماحول کو اس میں بڑی اہمیت ہے۔ عربوں کے ظریفانہ مذاق کی ایک اور صفت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا رنگ مہمانداری کے اصول و متعلقات میں زیادہ کھلتا ہے۔ اسی سبب سے طماعوں' نجیلوں اور کنجوسوں کو کچھ زیادہ

Marfat.com

ہی موضوع تفریح اور نشانہ تضحیک بنایا گیا ہے۔ اسی طرح تغفل اور بدحواسی کے لطیفے بھی بڑی اکثریت رکھتے ہیں۔ دراصل عربوں کی مہمان نوازانہ خصلت، اذیت دہی سے زیادہ معصوم مسرت بخشی پر زور دیتی ہے۔ اور قدرے شفقت و محبت کے پہلو لئے ہوئے ہے البتہ رقابت، قبائلی عصبیت اور باہمی مقابلے کی سپرٹ جن صورتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہاں مخالفت کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ ان صورتوں میں عربی ظرافت طعن و تعریض سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ شدید و شنام طرازی اور فحش گوئی میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ جریر اور فرزدق کے نقائص اور اس قسم کی دوسری ہجویات کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے! فحش گوئی کی بد مذاقی درباروں کے لاابالی امیروں اور شہزادوں کی وجہ سے بھی بہت بڑھتی اور الفیہ شلفیہ قسم کی کتابوں کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ عربی میں الف لیلہ کا سلسلہ ایرانی عربی ملے جلے مذاق کا نمائندہ ہے اسی طرح مقامات کی کتابوں میں ظرافت کی ڈرامائی صورت بھی ایک مخلوط ذوق کی آئینہ دار ہے، جس میں کردار کا عمل بھی ہے اور اس کی نکتہ آفرینی بھی کام کر رہی ہے۔

یہ تو تھی اس ظرافت کی کیفیت جس میں عربوں کا خاص رنگ جھلکتا ہے اب آیئے دوسری بڑی قوم یعنی ایرانیوں کے مخصوص رنگ ظرافت کا کچھ جائزہ لیا جائے۔ ایرانی ظرافت کی تشخیص اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کا اردو ادب پر خاص اثر پڑا۔ ہندوستان کا فارسی ادب اور اردو یکساں طور پر ان خصائص سے جو ایرانیوں کے ذریعے یہاں پہنچے۔ متاثر ہوا مگر یہ یاد رہے کہ ہم یہاں جن لوگوں کو اپنی سہولت کے لئے ایرانی کہہ رہے ہیں ان کو دراصل ”فارسی لکھنے والے“ کہنا چاہیے یا پھر آغاز ہی سے ان کو دو حصوں میں تقسیم کر لینا چاہیے، ایک وہ جو ایرانی تھے۔ دوسرے وہ جو تورانی تھے۔ ہندوستان پر پہلے تورانیوں کا اثر ہوا اس کے بعد ایرانیوں کا فارسی ادب کی ابتدا ہندوستان میں غزنویوں سے ہوئی اور اسی آخری خاندان کے زمانے میں صحیح معنوں میں ایرانیوں کا اثر بڑھا اگرچہ خود یہ لوگ ہرات و خراسان و ترکستان سے متعلق تھے۔ بہر صورت یہ دو الگ الگ رنگ ہندی فارسی ادب و ثقافت کی ہر شاخ میں کبھی مل جل کر کبھی الگ الگ نمودار ہو رہے ہیں۔ مگر ہمیں یہاں اس معاملے میں کچھ زیادہ تفصیل مطلوب نہیں۔

میں ترکی ادب سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ مگر ملا نصر الدین وغیرہ کی کہانیوں اور لطیفوں سے آشنا ہوں۔ اس کے علاوہ گب کی ترکی شاعری کی تاریخ کی وساطت سے جو کچھ معلوم ہوا۔ اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترکی کے متمدن ادوار میں بھی سپاہیانہ اور کوہستانی انداز ظرافت ہی غالب نظر آتا ہے۔ جملہ ترک اور تورانی قوموں میں واشگاف اور جارحانہ

Marfat.com

قسم کی مزاحیہ لہر موجود رہی ہے۔ جس میں محض خود کو خوش رکھنے کا جزبہ کار فرما ہوتا ہے۔ خواہ اس میں "نشانہ ظرافت" کی تضحیک و تحقیر کے شدید رنگ کیوں موجود نہ ہوں ایما اور کنایہ کی بلاغتوں سے ترکی ذہین شاید محفوظ نہیں ہوتا۔ ترکوں کے یہاں البتہ معما اور لغز اور چیستان کی دقیق اور پیچیدہ شکلیں زیادہ مقبول نظر آتی ہیں۔ ترکی ذہن وقت اور پیچیدگی کو حل کرنے میں بڑا لطف لیتا ہے۔ اور ذہنی خار اشگافی اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہی ذہنی اثرات اس فارسی ادب میں بھی ہویدا ہیں جو ترکوں اور تورانیوں کے زیر اثر وجود میں آیا۔ اس میں مُعمّا کی کتابوں کی بھرمار ہے۔ اور اس میں بڑے بڑے مصنفوں نے دلچسپی لی ہے۔

یہ مسلم ہے کہ فارسی ادب کے ابتدائی ادوار عربی کے اسالیب سے متاثر ہوئے۔ اور بعد میں اپنے مختلف رخ اختیار کرتے گئے۔ فارسی میں ہزل، پھکڑپن، تمسخر، ہجو، تحریف، معما، حکایت و مطائبہ، لطیفہ، بذلہ سنجی، طنز و تعریق اور ادبی نکتہ آفرینی وغیرہ بھی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ مگر تاریخ کا ہر دور اپنے اپنے امتیاز رکھتا ہے۔ سلجوقوں کے زمانے میں ہجو گوئی نے نہایت عریاں شکل اختیار کی۔ اس زمانے میں غالباً ترک فوجیوں کے زیر اثر ظرافت میں بدویانہ سادگی یا بغداد کے متمدن جنس آلود زنگ کی بجائے عسکریت کی بے تکلفی اور کرختگی محسوس ہوتی ہے۔ ہجو یہ فحش گوئی اور جنسیات کے متعلق صاف گوئی ایک خاص چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ شہر آشوب کی صنف جو کچھ عجب نہیں کہ ہندوستان سے مسعود سعد سلمان وغیرہ کے ذریعے پہلے فارسی میں اور پھر ترکی میں اور بعد میں اردو میں پہنچی۔ اپنے ابتدائی ادوار میں بعض دفعہ جنسی موقوعوں اور بعض اوقات دوسرے فحش مضامین کے لیے وقف ہو گئی۔ اور اس میں اصلاح اس وقت ہوئی جب اردو شاعروں نے اس کو سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ حکیم سنائی جیسے صوفی اور نظامی گنجوی جیسے حکیم اور ثقہ بزرگ بھی مذاق کی اس برہنگی سے بچ نہیں سکے۔ سنائی کے کارنامہ بلخ میں بعض عام باتیں بھی گالیوں کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔

یہ سب کچھ درباروں اور درباری امرا کے زیر اثر تھا۔ جو ابھی تمدن کی نفاستوں میں ڈھل نہیں سکے تھے اور زندہ دلی اور تفریح کی یہ صورتیں اختیار کر رہے تھے۔ سوزنی، انوری، خاقانی ابو العلا گنجوی وغیرہ کی ہجویں بھی ہر طرح کے اخفا و ایما سے خالی ہیں۔ اور اس زمانے میں یہ برہنگی اتنی عام ہوئی کہ ایک عرصے تک مذاق عامہ کا جزو بنی رہی۔ یہاں تک کہ جب سعدی نے ذوق کی اصلاح کی اور اپنی حکایات اور نکات و لطائف سے برہنگی کی جگہ نکتہ و ایما کی لطافتوں کو آشکارا کیا۔ تب بھی برہنگی کا ذوقی مطالبہ اتنا شدید تھا کہ سعدی تک کو

خیثات و ہزلیات سے اعتنا کرنا پڑا۔ اور اس کا اثر بعد تک بھی رہا۔ چنانچہ بعد کے زمانے بھی اس مذاق سے خالی نہیں۔

بااین ہمہ فارسی ادب اس ابتدائی زمانے میں بھی متوازن ظرافت سے خالی نہیں رہا اور قطعات کی صنف ہر زمانے میں رچی ہوئی ظرافت سے لبریز رہی ہے۔ اس سلسلے میں سعدی اور متبعین کو ملیہ مقام حاصل ہے۔ فارسی ادب خصوصاً شاعری بھی سنبھلی ہوئی ظرافت سے بڑا کام لیتی رہتی ہے۔ اس غرض کے لئے حکایت کا استعمال بڑی کثرت سے ہوا ہے۔ سنائی' عطار' نظامی رومی سبھی نے حکایت کا استعمال کیا ہے۔ اس میں واقعات کم اور لفظی ظرافت زیادہ ہے۔ بعض جگہ زندگی کی ludicrity سے کھلی پند آموزی کا کام لیا گیا ہے۔ رومی کے یہاں بیان کی برہنگی پائی جاتی ہے۔ اور واقعات زندگی کے مضحیک پہلوؤں سے حکمت کا سبق نکالا ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی کہانیوں سے تعجب خیزی بھی کی ہے۔ اور اس قسم کا خاصا سرمایہ فارسی کی کتابوں میں ملتا ہے۔

پرندوں کی کہانیوں میں جو نکتہ آفرینی ہے وہ سبق آموزی کے مقصد کی حامل ہے۔ اور یہ عنصر ہندوستان کے ادب سے فارسی میں منتقل ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی بنیادی فضا نرم اور لطیف ہے۔

فارسی میں مقامات حریری اور مقامات بدیعی کے انداز پر مقامات حمیدی بھی لکھی گئی اور دلچسپی پیدا کرنے والے کرداروں کے ذریعے تفریح و نصیحت کو ملانے کی سعی کی گئی ہے۔

فارسی شاعری میں عبید زاکانی بسحق اطعمہ اور نظام الدین البسہ نے تحریف یا "تقلیب خندہ" کی جدتیں بھی کی ہیں جن کا حال سب کو معلوم ہے۔

غرض اس نوع کا خاصا ادبی سرمایہ فارسی میں موجود ہے جس سے ظرافت کی ایک اچھی خاصی روداد مرتب ہو سکتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایرانی تصورات کی رو سے ظرافت کی اعلیٰ ادبی قسم شاید وہی سمجھی گئی ہے۔ جو پردہ داری اور ایمائی لطافتوں کی آئینہ دار ہو۔ اور برہنگی کی بجائے اشارہ و اخضا پر منحصر ہو یا کرختگی اور درشتی کی بجائے نفاست و لطافت سے بیان ہو' کھلی ہنسی یا خندۂ بے جا کی روایت اعلیٰ ایرانی ذوق کو شاید کبھی گوارا نہیں ہوئی۔ اور اگر کہیں فارسی میں موجود ہے تو اسے ترکی تورانی اثرات کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایرانی ظرافت واقعہ کی مزاح انگیزی میں بھی زیادہ تسکین نہیں پاتی۔ اس کی اصل فضا گدگدی کی طرح نرم و نازک ہے جو مختصر لطیفے یا رمزی اور ایمائی نکتے میں ہی شادابی

حاصل کرتی ہے ــــ اور بسا اوقات ایک ہی پہلو دار لفظ کے استعمال میں وہ مزا دے جاتی ہے جو لمبے لمبے ڈرامائی اظہارات سے بھی اسے نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی ظرافت نثر میں زیادہ پھلی پھولی نہیں۔ اس میں جزئیاتی تفصیل Description کی ظرافت زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئی۔

گویا ایرانی ظرافت ادبی بلاغتوں کے اس تصور سے زیادہ آشنا ہی ہے۔ جسے بلاغت والوں نے یوں ادا کیا ہے' الکنایة ابلغ من الصراحتہ' ــــ لہٰذا لفظی نکتہ آفرینی (Wit) ہی ایران اصلی میدان کمال ہے! اور ایک خاص معنی میں ایرانی مزاح کی اعلیٰ ترین نمود حکایت غزل کے قماش میں ہوئی ہے۔ جہاں طنز اور نکتہ آفرینی نے مل کر عجب حسن دکھایا ہے۔ اور یہ کوئی غیر متوقع امر نہیں کیونکہ غزل کلبی مزاج اِس پردہ داری کی روح کو جذب کر سکتا ہے۔ جس کا بہترین خارجی نمائندہ مغل ایرانی مذاق تھا۔

مسلمانوں میں ادبی اسلوب کی اساس ارسطو کی بلاغت پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے علم بیان اور علم معانی وجود میں آئے۔ اس کے کچھ حصے کو فرد بصرہ کے نحویوں نے مرتب کئے۔ جنہوں نے عرب کے عملی پیرایہ ہائے بیان کا جائزہ لے کر ان کی عقلی شیرازہ بندی کی۔ بنو عباس کے زمانے میں بلاغت کا فن اور بھی ترقی پذیر ہوا اور یونانی اصولیات کی روشنی میں منطق سے لے کر ادب کی حدوں میں داخل ہوا۔

عربوں نے ــــ یا ان ابتدائی عربی ادیبوں نے اظہار و بیان کی اکثر صورتوں کو مکتوب نگاری' ترسُل یا دبیری کے فنون میں آزمایا جن سے ادبی اسلوب کا ایک خاص فن ظہور میں آیا۔ مترسلین اور دبیروں نے دو باتوں کا خاص خیال رکھا' ایک بیان کی آرائش و زیبائش' دوسری حسب ضرورت ایماد تلویح۔ تاکہ ایجاز کی ضروریات پوری ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کی اعلیٰ انشا پردازی میں کنایہ اور استعارہ کو بہت فروغ نصیب ہوا اور تشبیہہ و تمثیل سے اعتنا عموماً بے رنگی کی علامت سمجھی گئی۔ استعارہ کو بیان کے ایجازی برجستگی قائم رکھنے کے لئے اور کنایہ کو مخفی معانی کے اشارات کے لئے اس ستعمال میں لایا گیا اسی وجہ سے عربی انشا میں کھلے مزاح سے زیادہ طنز کو فروغ ہوا۔ اور نظم کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ نثر میں طنز کو جذب کیا گیا ہے۔

مگر عربی روح ظرافت سمٹنے اور چھپ کر دار کرنے سے گریزاں ہے۔ اس میں اسی لئے واشگاف اظہار اور برہنہ گوئی غالب ہے اسی لئے جب مصنف ذرا بھی غیر محتاط ہو جاتا ہے تو بیان صاف صاف تمسخر کا انداز اختیار کر جاتا ہے۔ عربی ظرافت واقعات کے تضحیکی عناصر

Marfat.com

پر زیادہ انحصار رکھتی ہے اور اگر اس میں لفظی ظرافت ہے تو ایرانی اثرات کے رہین احسان ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ ادبی اسلوب میں ایمائی عنصر کا سلسلہ ہنسانے کے جذبے سے زیادہ چونکا دینے کے جذبے سے شروع ہوتا ہے۔ جس کی آخری منزل تبسم یا زیادہ سے زیادہ خندہ دنداں نما تک پہنچتی ہے۔ واشگاف ہنسی کے انداز ادبی اسلوب کے چہرے پر فارسی یا ایرانی نثر ادبی عربی منصفوں کو بھلے معلوم نہیں ہوئے اور ہنسی میں بھی توازن ثقاہت یا وقار کا خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ بات بھی ہو جائے اور بات کرنے والا غیر متوازن بھی نہ ہو۔ یہ غایت ایرانی رنگ کی سنجیدہ ادبی روایت کا جزو تھی اور اسی کو ایرانی ذوق کا نمائندہ سمجھنا چاہیے۔

فارسی میں بلاغت کی کتابوں میں اس سلسلے میں کچھ نکتے مل جاتے ہیں، مثلاً ایک اچھے ادبی اسلوب کیلئے تین چیزوں کی بطور خاص ضرورت سمجھی جاتی ہے: برجستگی، نمکینی اور شوخی ان اصطلاحوں کے معانی میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے عمل استعمال کی صورتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برجستگی ظرافت کے سلسلے کی اولین لہر ہے جو قاری کے دل میں بیان کے متعلق ایک آگاہی سی پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات تو شاید یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس بیان میں ظرافت کا کوئی انداز موجود بھی ہے مگر اکثر اوقات ایک برجستہ بیان ظرافت کی چاشنی لیے ہوئے ہوتا ہے۔

نمکینی کی اصطلاح بھی بڑی بامعنی ہے۔ کلام میں نمک ہونے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس سے سننے والے کی اسی طرح دلکشائی ہو جس طرح کھانے میں نمک سے ذائقے کو فرحت ہوتی ہے۔ کلام کی نمکینی دراصل انشا پرداز کا یکطرفہ فعل نہیں بلکہ متعدّی بغیر ہے۔ اس میں عموماً وہ صورت ہوتی ہے جسے کسی لفظ کی عدم موجودگی میں Wit کے نام سے یاد کر لیجئے۔ یہ بالعموم لفظوں کا کھیل ہوتا ہے، لفظوں کی پہلودار کاٹ سے معانی کی دلکشائی پیدا کی جاتی ہے۔ نمکینی کا عمل سننے والے کو تبسم کی حدوں تک پہنچا سکتا ہے ورنہ بالعموم اس کی کیفیت داخلی رنگ کی ہونی چاہیے۔ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اس کے آثار کا ظاہر یقینی ہے۔

شوخی ہماری فنی اصطلاحوں میں عجیب پہلودار لفظ ہے۔ یہ کہیں معصوم شرارت کے معنے میں استعمال ہوتا ہے کہیں، ناز بے جاء کا مفہوم رکھتا ہے۔ کہیں ستم ظریفی کے رنگ رکھتا ہے۔ مگر یہ صفت ہے متعدّی بغیر۔ وہ شوخی شوخی نہیں جس سے دوسرا متاثر نہ ہو اس میں معصوم شرارت کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے اور اس کے ساتھ حسن یا لطف کا پہلو بھی شریک ہوتا ہے۔ شوخی میں ہلکی سی دراز دستی، پُرلطف سی جرأت اور نازنینانہ بے باکی اور ستم ظریفی

بھی ہوتی ہے، مگر اس میں کینہ ' غصہ ' انتقام اور تعدی کا رنگ نہیں ہوتا بلکہ یہ کچھ ایسی دراز دستی ہوتی ہے جو پیاری معلوم ہوتی ہے۔

شوخی ایک لفظی عمل ہے مگر یہ دراصل ایک طرز احساس بھی ہے اور بیان کا لہجہ بھی بظاہر اس کا تعلق اسلوب بیان سے بھی ہے اور حسن معنی سے بھی۔ بلکہ ہر حسن ادا سے (خواہ وہ لفظوں میں ظاہر ہو یا جمال انسانی کے انوکھے کرشموں میں یا فطرت کے کسی تعجب خیز اور انبساط خیز عمل میں) بشرطیکہ اس سے طبیعت میں برجستگی اور احساس راحت پیدا ہوتا ہے۔ غرض یہ قدرے غیر متوقع مگر انبساط بخش عمل ہے جس میں تھوڑا سا جارحیت کا عنصر بھی شامل ہے مگر لطف خیز اور ہلکا ہلکا...... تیز نہیں! (غالب)

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بہر صورت شوخی متعدی بغیر ہونے کے باوجود ' اپنے نشانہ یا موضوع کیلئے قلبی اذیت دہی کے ارادے سے خالی ہوتی ہے۔ مگر ظرافت کے سلسلے کے آئین کی بیشتر صورتیں نشانہ کی دل آزاری کے ارادے سے بھی ہو سکتی ہیں اور دل آزاری کا موجب بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ظرافت کی ایک تیز مگر سمٹی ہوئی صورت (طنز) خفا کے باوجود باعث اذیت ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد تعریض ' تلویح ' اتہام ' پھبتی وغیرہ وغیرہ کئی اور صورتیں بھی ہیں جن کے اپنے اپنے رنگ ہیں۔ جن کا استعمال کبھی طنز میں کبھی کھلی ہجو میں کیا گیا ہے۔ بعض ہجو میں اخفایا پوشیدگی ضروری نہیں۔ اور اگرچہ نعمت خاں عالی نے وقائع حیدر آباد میں اورنگزیب کے جملہ حیدر آباد کی تعریضی ہجو کی ہے مگر اس کو ہجو کی بجائے تعریض کی صف میں رکھنا مناسب ہو گا۔ ہجو عموماً ایک کھلی ڈلی چیز ہوتی ہے۔ ہجو کیلئے ضروری نہیں کہ اس میں کسی خاص شخص کا نام آئے ' ہاں انداز اظہار کھلا ہوتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی نظم خواجہ سگ پرست میں جیسے نام لیے بغیر کسی شخص معلوم کی ہجو کی ہے۔ مگر سودا کی اکثر ہجویات کی طرح شخص متعین کی ہجو بھی ہو سکتی ہے مگر صفات مذموم میں تعریض کی جگہ برہنہ گوئی کی گئی ہے۔

اس کے بعد ہزل کی صورتیں جو ہیں۔ بالارادہ غیر سنجیدہ اظہارات کا درجہ رکھتی

Marfat.com

ہیں۔ ہزل ضروری نہیں کہ کسی شخص کے خلاف ہو—— نہ اس کی ماہیت میں ایذا کا عنصر ہے ہزل وقتی اور ہنگامی تفریح کی چیز ہے جس میں مقصد فقط محظوظ کرنا ہے اس شخص یا گروہ کو جو اس قسم کے اظہار سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے—— اور تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ ثقہ لوگ بھی بعض لحات میں اس قسم کی غیر ثقہ باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہزل کی ایک قسم الہزل بمائراد بہ الجدّ بھی ہے۔ جو بظاہر ہزل ہوتی ہے مگر اس کے پردے میں کوئی سنجیدہ حقیقت بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ کوئی بات بظاہر سنجیدہ ہوتی ہے مگر اس سے ایک غیر سنجیدہ پہلو نکلتا ہے۔

اردو فارسی ادب میں تحریف و تصحیف کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو ہزل میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسلمان سلاطین کے درباروں میں ندیمی اور مصاحبی کا ایک خاص بے قاعدہ یا باقاعدہ منصب ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا کام مجلس آرائی ہوتا ہے جو اپنے بادشاہ یا امیر کو خوش رکھنے کیلئے ظرافت کی ہر صورت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ غالباً بادشاہ وقت کی استعداد اور مزاج کے مطابق حکایت' لطیفہ' ہزل' استہزا' نکتہ سنجی' معما' چیستان' شعر۔ جس سے بھی ضرورت پوری ہوتی تھی اس کو یہ کام میں لاتے تھے۔ ان کا یہ منصب یا ان کے یہ فرائض ادب اور ادیب کے منصب یا فرائض سے بھی جا ملتے تھے۔ مگر یہ مسلم ہے کہ اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور انشا پردازوں نے ظرافت کی ادبی روح کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ اور ان کے یہاں ظرافت کی وہی لطیف صورتیں زیادہ مقبول رہی ہیں جو سنجیدہ سمجھی جاتی تھیں۔ اور جن کو میں نے گزشتہ صفحات میں اسلوب کی بلاغت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور یہ صفات ہیں برجستگی' نمکینی اور شوخی۔ یہی صفات فارسی ادب میں بہت مقبول رہی ہیں اور ان کے صدہا اعلیٰ نمونے فارسی میں نظر آتے ہیں' جن کا انتخاب کوکا نے اپنی کتاب فارسی مزاح و ظرافت میں کیا ہے۔

مگر یہ یاد رہے' ظرافت کی یہ سب مثالیں جو کوکا نے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ خالص ایرانی ذہنیت کی نمائندہ نہیں ان میں سب رنگ ملے ہوئے ہیں جن میں سے بعض کا سطور بالا میں ذکر آیا ہے۔ اردو میں ایک خاص زمانے تک ایرانی تورانی اطوار ظرافت رائج رہے بعد میں مغربی اثرات وارد ہوئے ان کے زیر اثر وہ تنوجات جلوہ گر ہوئے جو مغربی ادبوں میں موجود ہیں اس لیے اردو مزاح کی کہانی مخلوط ہے تاہم اس پر فارسی کے اثرات مسلم ہیں اور قدرے ہندی کے بھی مگر اردو مزاح کا بہت بڑا سرمایہ مغربی رنگ کا ہے۔ اس کی

Marfat.com

عمدہ تفصیل ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب اردو ادب میں پیش کی ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مغل ایرانی مزاج ایک ایسی سنبھلی ہوئی ظرافت کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے وقار اور سکون کے لحاظ سے ایک معتدل انداز کے زیادہ قریب ہے جو اسلام کا پیش کردہ ہے۔ اس میں بہت کھل کر ہنسنے اور کھل کر ہنسانے کی بجائے محظوظ کرنے اور متبسم کرنے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں وہ پردہ داری بھی ہے جو اسلامی تمدن میں' معاشرہ کے ہر رنگ میں ہمیشہ موجود رہی ہے (برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است)۔ شاید اسی لیے بلاغت کو ایمائی خوبیوں میں منحصر سمجھا گیا۔ اور شاید اسی لیے غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کے ایجاز کے علاوہ اس کے رمزیہ بیان پر موقوف رکھی گئی ہے! اسی قسم کے اسباب سے مسلمانوں میں ڈرامے کو بھی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ یہ سنبھلی ہوئی مزاحیہ کیفیت اور سنجیدہ تفریح کے منافی چیز سمجھی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ بغداد عرب اقوام کا مرکز تھا اور ترک اور تورانی اسلام کے بڑے محافظ رہے ہیں مگر صحیح شاید یہ ہے کہ اسلامی روح ظرافت کی صحیح نمائندگی مغل ایرانی مذاق ہی نے کی ہے کیونکہ وہی امن کے اصل تصور حیات کی ترجمانی کر رہی ہے۔

مئے صافی زفرنگ' آید و شاہد زنتار
ماند انیم کہ بغدادے دبسطامے ہست

حوالہ جات

1 ان مصنفوں میں الحوشب الاسدی' عُروہ بن عبداللہ' الغاضری' المخزومی' ابو عمر الاعرج' ضمضام المدینی کے نام دیئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (Rosenthal) کی کتاب عربوں کی ظرافت۔

Marfat.com

چھٹا باب

اسلامی ہندی کلچر

محمد بن قاسم کی فتوحات کے ساتھ' برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں (عربوں) کے باقاعدہ داخلے کا آغاز ہوا۔ عرب و ہند کے تجارتی تعلقات اس سے پہلے بھی تھے (دیکھیے سید سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات) لیکن مذکورۂ بالا فتوحات نے ہندوستان میں اسلام کی آمد کا اعلان کیا۔ مسلمان سندھ میں کم و بیش ڈھائی تین سو سال' حکمران رہے۔ اس کے بعد شمال سے محمود غزنوی کے حملوں سے فتوحات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت قائم ہو کر پھیلتی گئی اور غزنیوں کے بعد کئی دوسرے خاندانوں میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو کر کئی صدیوں تک قائم رہی۔

ان کئی صدیوں میں اسلامی کلچر ایک نئے تجربے سے گزرا۔ اس ملک کی آبادی بہت سے مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ عرب' ایرانی اور تورانی باہر سے آئے۔ مقامی مسلمان یہاں سے امت مسلمہ میں شامل ہوئے۔ یہ سب اقلیت میں تھے اور مقامی غیر مسلم اکثریت میں تھے۔ ان کے میل جول سے ایک نئی قسم کی معاشرت پیدا ہوئی۔

اس نئی معاشرت کے مختلف رنگ تھے جن میں اسلامی عقائد و اقدار نے مشترک نقوش پیدا کیے۔ چنانچہ رنگا رنگ کے باوجود اس معاشرت میں اشتراک کے کئی پہلو پیدا ہو گئے۔ ایک رنگ تو برسر اقتدار ایرانی یا تورانی عنصر کا تھا جو خالصتاً خارجی تھا۔ دوسرا مخصوص رنگ مقامی غیر مسلم آبادی کی اکثریت کا تھا' جس کی نمائندگی زیادہ تر دیہات و قصبات میں تھی' تیسرا رنگ مقامی مسلم آبادی کا تھا جو مقامی غیر مسلم آبادی کے رنگ اور مستعار ایرانی تورانی رنگ کے امتزاج کا نمائندہ تھا۔

ہندوؤں کے مخصوص طرز معاشرت کی تفصیل کئی کتابوں میں آئی ہے ... ی (فتوح البلدان) السعودی (مروج الذہب) البیرونی (تحقیق ماللہند) امیر خ وغیرہ) ابن بطوطہ (عجائب الاسفار) بابر (واقعات بابری) اور ابوالفضل (آئین

Marfat.com

موضوعات پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ اسلام کی آمد سے کچھ پہلے کے حالات پروفیسر وادیا کی کتاب Idea on the Eve Muslim Conquest میں مذکور ہیں۔

میں اس موقع پر جزئیات کو قلمبند کرنے سے قاصر ہوں، مجملاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ایک عجیب وغریب تمدنی تجربہ ہوا۔

ہند کے اسلامی کلچر کا بیشتر دینی حصہ تو تقریباً وہی تھا جو سارے عالم اسلام میں رواج پذیر تھا۔ لیکن بعض دینی رویے۔ ہندوستان سے اس لیے مخصوص تھے کہ یہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ملک کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ان کا معاشرتی رویہ کیا ہو۔ اور ملک کی مقامی معاشرت کے وہ کون سے حصے ہیں جن میں قائم رکھنے میں (بہ حیثیت مسلمان) کوئی مضائقہ نہیں اور وہ کونسے حصے ہیں جنہیں یکسر ترک کرنا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں محمد تغلق اور فیروز تغلق کے عہد کے ایک عالم ضیاءالدین سنامی کی عربی کتاب نصاب الاحتساب اور فتاویٰ غیاثیہ کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا — یہ تو ظاہر ہے کہ اقلیت میں ہونے کے باعث مسلمانوں کو اپنے رویے میں کچھ شدت روا رکھنی پڑی چنانچہ مغلوں سے پہلے کے دور میں، مسلمانوں کے رویے میں داخلی طور سے، ایک طرح شدت پائی جاتی ہے۔ اور مسلمان دینی لحاظ سے اپنے الگ تشخص پر شدید اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ملک داری کی ضرورتوں کی وجہ سے مسلمانوں کا مقامی اکثریت سے الگ تھلگ اور بے تعلق رہنا ناممکن تھا۔ ہر چند کہ ہندومت کا برہمنی مزاج، تمام غیر ملکیوں کو ملیچھ وناپاک) قرار دیتا رہا مگر زندگی کی ضروتیں فطرتاً ان حد بندیوں کی مخالف ہیں اس لیے میل جول بڑھتا رہا (خصوصاً صوفیانہ تحریکوں کی وجہ سے) یہ صحیح ہے کہ دیہات کی وسیع آبادی، زرعی معیشت کے مستقل اسلوب کی وجہ سے، مسلم حکمرانوں سے زیادہ میل جول پر مجبور نہ تھی کیونکہ مالیہ لگان کے معاملات کے سوا انہیں حکومت کے کارندوں سے کچھ زیادہ واسطہ نہ پڑتا تھا۔ نزاعات و خصومات کے فیصلے پنچایتوں میں ہوتے تھے اور پنچائتیں اپنے ہی لوگوں کی ہوتی تھیں (دیکھئے جان میتھائی: Panchayat System of India

ان حالات میں میل جول کے سب سے بڑے مقام صوفیوں کی خانقاہیں تھیں جہاں انسان کو انسان سے ملانے کی کوششیں ہوئیں۔ اس ملاپ کا سب سے بڑا وسیلہ دکھ تھا۔ اس سے دردمندی کا ایک مشرب ابھرا جس میں صوفی حضرات کے نزدیک بلاامتیاز مذہب و ملت سے انسان برابر تھے۔

Marfat.com

اسلام کا تمدنی تجربہ یوں بھی مقامی معاشرتوں کے بارے میں روادار ثابت ہوا ہے۔ وہ بین الاقوامی مذہب ہونے کی وجہ سے ہر ملک کی معاشرت کے بے ضرر حصے کو قائم رکھنے کو گوارا کرتا ہے مگر ہندوستان میں صوفیہ کے مسلک محبت نے اس راستے کی بہت سی بندشیں بطور خاص اڑا دیں۔ اور انسانوں کو محبت کے وسیلے سے باہم ملایا' اس کے نتیجے میں دو مختلف معاشرتوں میں خاصا امتزاج ہوا۔ اور اس طرح' ایک مخصوص امتزاجی معاشرت وجود میں آئی جس میں مقامی رنگ پر اسلامی نقش ثبت ہوا۔ (ہندو کلچر پر اسلامی کلچر کے اثرات کے لیے دیکھئے تاراچند:

linfluence of islamic Culture on Indian Culture.

یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اس موقع پر اس مخصوص طرز معاشرت اور مخصوص کلچر کے چند نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ ممکن ہے۔ (یاد رہے کہ معاشرت کلچر کا ایک شعبہ ہے جو انسانوں کے باہم نباہ اور برتاوے کے آداب و رسوم اور مجلسی طور طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کلچر وسیع تر لفظ ہے جس میں ذوقیات تفریحات وغیرہ بھی شامل ہیں)۔

بہر حال کلچر جن چیزوں سے عبارت ہے وہ یہ ہیں:-

(1) رہنے سہنے کے طریقے؛ (2) کھانے پینے کے آداب؛ (3) میل جول کے آداب' دید' وادید کے رسوم' وضعداری' قرابت داری وغیرہ؛ (4) رسوم ورواج' شادی بیاہ' میلے تیوہار؛ (5) ورزشیں خصوصی اجتماعی شوق اور مجلسی تفریحات؛ (6) دیگر ذوقی مشاغل بزم آرائی (محافل موسیقی و شعر گوئی)' مصوری' شکار' کھیل' پرندوں کی تربیت' آرائش زیبائش اور (7) مذکورۂ بالا کے اہتمام و انصرام کے ذرائع جنہیں فنون لطیفہ اور فنون مفیدہ (صناعات) کی صورت میں انجام دیا جاتا ہے۔

اس فہرست کے مندرجات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (الف) معاشرتی تنظیمی حصہ اور (ب) ذوقی حصہ۔ معاشرتی تنظیمی شعبے کا ایک حصہ معین دینی عقائد کے تابع تھا' مثلاً پرسنل لا (قوانین شخصی) وغیرہ...... لیکن اس کا ایک حصہ وہ بھی تھا جو آزاد تھا' مثلاً قوانین شخصی کے ضمن میں آزاد رسوم ورواج......' یہی وہ حصہ ہے جس میں مقامی معاشرت سب سے زیادہ اثرانداز ہوئی۔ ان رسموں اور رواجوں کے بعض پہلو ایسے بھی تھے جو اسلام کی بنیادی مجلس اقدار کے منافی تھے چنانچہ ان کے خلاف اکثر (رد بدعت کے نام سے) اصلاحی تحریکیں بھی ابھرتی رہیں جو ان معاشرتی اسالیب کے بے ضرر حصے پر بھی معترض ہوتی رہیں۔ لیکن مقامی عام رسوم کا ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بڑا حصہ ہے۔ اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا کیونکہ اسلام کی معاشرتی رواداری اور فطرت پسندی اور معقولات کا تقاضا یہی تھا۔

Marfat.com

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جزوی بیرونی نقوش کے باوجود' ہندوستان کے عام مسلمانوں نے لباس وپوشاک' میلے تیوہار' دید وادید کی رسوم' اور شادی بیاہ کے عمومی رواجوں میں جائز مقامی نقوش کو باقی رکھا۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہندی مسلم ذہن محض تخیلاتی تھا عملی نہ تھا۔ اس کی تردید اس عظیم الشان انتظامی ڈھانچے اور ان سیاسی ادارت و تدابیر سے ہوتی ہے جن کی استواری اور گرفت نے کم و بیش آٹھ سو سال اس ملک میں اسلامی سلطنت کو مضبوط و مستحکم رکھا۔ بلاشبہ ہندی ذہن کا ایک پہلو فلسفیانہ اور تخیلاتی تھا تاہم اس کے باوجود ان مقامی اسالیب میں' مسلمانوں نے اپنے الگ تشخص پر برابر اصرار کیا' مثلاً ملاقات اور دید وادید' نشست برخاست اور لباس کی ساخت وغیرہ میں کوئی نہ کوئی پہلو ایسا باقی رکھا جس سے مسلمان الگ الگ پہچانے جا سکیں۔

مسلمانوں کے لباسوں پر' ان کے ذوق سپہ گری کا بھی خاص اثر نظر آتا ہے۔ سپاہیانہ لباس میں چستی' بدن کی پھرتی اور رعب داب کا لحاظ قدرتی ہے اسی وجہ سے مسلمانوں کے لباس تورانی وضع کے زیادہ قریب تھے۔

لباسوں کی تراش خراش پر عبادات کی ضرورتوں نے بھی اثر ڈالا۔ طہارت داخلی کے علاوہ' ظاہری صفائی اور حیاداری بھی مدِنظر رہی اور لباسوں میں یہ بھی ملحوظ رہا کہ نماز وغیرہ میں رکاوٹ بننے والا کوئی پہلو موجود نہ ہو۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ لباس کے بارے میں اسلام کی دی ہوئی وسیع آزادی و رواداری (جو جغرافیائی اور معاشی تقاضوں کے تابع تھی) کے باوجود مذکورۂ بالا چند پابندیاں بہر حال ملحوظ رہیں۔ اور اس میں سب سے زیادہ حفظ احترام عبادت' حفظ آداب حیا' حفظ ذوق سخت کوشی اور حفظ ناموس بدن کو اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کیلئے ریشمی لباس کو مکروہات و ممنوعات کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ریشمی لباس میں تفاخر ہے اور اس سے غیر مساواتی طریق زندگی ظاہر ہوتا ہے۔

یہی حال کھانے پینے کے آداب کا تھا۔ مسلمانوں میں رزق کو خدا کا فضل واحسان سمجھا گیا ہے' اس لیے رزق کے حصول اور اس کے استعمال کے سلسلے میں' احترام و وقار کے جملہ آداب ملحوظ رکھے گئے۔

کھانے پینے کے سلسلے میں معنوی طور سے رزق حلال کے علاوہ کھانے پینے کی حیوانی و نباتی و معدنی اشیاء وغیرہ کی نوعیت میں بھی حلال' پاک اور ممد حیات عناصر کا ہونا ضروری تھا۔ ظاہری ناپاکی اور مضر صحت اجزا کی موجودگی سے سخت نفرت رہی اور اس بارے

میں اسلام کے آداب طہارت اور قوانین نجاست کا خاص خیال رہا۔

شکار ایک شوقیہ مشغلہ تھی لیکن یہ کھانے پینے کی اشیاء کے حصول کا بھی ذریعہ تھا۔ اس میں بھی یہ مدِنظر رہا کہ پرندے یا جانور (آبی وبرّی) کو بری طرح نہ مارا جائے۔ اور اس کے شکار میں ایسی کوئی صورت نہ ہو جو ایک عام سلیم المزاج آدمی کیلئے کراہت طبع کا باعث ہو۔

ہندوستان میں جین مت اور بعض دوسرے فلسفوں کے سلسلے میں' جانداروں سے ہمدردی کی وجہ سے شکار کو مکروہ سمجھا جاتا تھا لیکن مسلمانوں نے انسانی معاش کی مجبوری کے قانون فطری کے تحت شکار پر یہ پابندی روا نہ رکھی اور اسے ایک فن معقول ولطیف بنا دیا مگر اس کے ساتھ بے دردی اور بے رحمی کو بھی منع کر دیا۔

کھانے پینے کے طریقوں میں یہ امر بھی ملحوظ تھا کہ رزق کا احترام ملحوظ رہے' کوئی امر کراہت طبع کا باعث نہ ہو اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو اصول اخوت ومساوات کے خلاف ہو—' یا اصول کفایت شعاری کے منافی ہو— جن باتوں میں تکلف' و تفاخر کے غیر مساواتی پہلو نکلتے ہیں' مثلاً سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا ان کو مکروہ سمجھا گیا۔

کھانے پینے کے سلسلے میں کرسی وغیرہ کا رواج ممنوع نہ تھا (کیونکہ اس میں بھی بہر حال رزق کا احترام قائم ہے) مگر عام رواج فرش پر دستر خوان بچھانے کا تھا۔ شاید اس میں بھی وہ سادگی اور کفایت شعاری اور مساواتی پیمانے پر ساز وسامان کے سہل اصول ہونے کا پہلو مدِنظر رکھا۔ ہاتھوں سے کھانے کو ہمیشہ ترجیح ملی کیونکہ اس میں سہولت مدِنظر تھی۔ اور عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہاتھوں سے کھانے میں لذت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ مسلمانوں کے کھانے' ہندوؤں کے کھانوں سے کئی اعتبار سے مختلف تھے۔ ایک تو ہندوؤں میں گوشت کی ممانعت نے از خود امتیاز قائم کر دیا تھا۔ اس پر ذائقے کا اختلاف واضح تھا۔ ہندو ذائقہ کھٹاس میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے (مثلاً اچار بہت مرغوب ہے) مسلمانوں کا ذائقہ نمکین میں لطف حاصل کرتا ہے۔ امیر خسرو نے اپنی انشا (مفاتیح الاعجاز میں) اسے ترکوں کا ذوق خاص قرار دیا ہے۔ مسلم ذائقہ' گھی اور دیگر روغنیات کا دلدادہ ہے۔ ہندو ذائقہ سرسوں کے تیل کا عادی ہے' بھینس کے دودھ اور گائے کے دودھ کا فرق بھی واضح ہے۔ لال مرچ ہندوستان کی خاص چیز ہے۔ تورانی ایرانی ذوق اس میں اعتدال روا رکھتا رہا۔ ہندوستان (خصوصاً جنوبی) میں لال مرچ کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

انہیں مرکبات کے اندر سے' پلاؤ اور چلاؤ کی ترکیب ہوئی جو ایران کے مشرقی حصے' خراسان ترکستان سے ابھری اور سارے ایشیا میں پھیل گئی۔

Marfat.com

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج ہم جن مٹھائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر' مسلمانوں کے ساتھ آئیں۔ (دیکھئے پروفیسر شیرانی: پنجاب میں اردو' اور ان کے مقالات) آج بھی ان کے ناموں کی اکثریت فارسیت عربیت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی حال مشروبات کا ہے۔ ان کے ناموں کی تحقیق کیجئے تو ان میں سے اکثر اسلامی طب کے ساتھ ہندوستان میں وارد شدہ نظر آئیں گے۔

کپڑے کی صنعت ہندوستان میں بھی تھی مگر اس میں ترقی کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں خود تیار کردہ باغوں (باغ آرائی) کا رواج نہ تھا۔ ہندوستان میں درختوں کے باغ ضرور موجود تھے۔ جن میں کھانے پینے کی مادی ضرورت مد نظر تھی جمالیاتی تقاضا موجود نہ تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد ملک کے ہر ہر حصے میں گل ہائے رنگ رنگ کے باغ تیار ہوئے...... سلاطین و امرا کے باغوں کے علاوہ' عام استطاعت والے لوگ بھی باغ بنا لیتے تھے۔ باغ آرائی کا فن مغلوں سے پہلے ترکوں کے دور حکومت میں بھی ترقی پر تھا' ملاحظہ ہو (امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین وغیرہ) باغوں میں آبشاریں اور فوارے بھی عہد اسلامی میں آئے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان خود اچھے اچھے پھل دار درختوں کا ملک ہے مگر اس ملک میں بہت سے پھل دار درخت (خوبانی' بادام' ناشپاتی' سیب وغیرہ مسلمانوں کے ساتھ آئے۔ (ملاحظہ ہو نوا درالالفاظ مصنفہ خاں آرزو جس میں آلوچہ وغیرہ کی عمدہ تشریح ہے) چمن کا تصور بھی مسلمانوں کا آوردہ ہے۔ چمن اس چبوترے (مسقف یا غیر مسقف) کو کہتے ہیں جو سبزے اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان بیٹھنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔

تنور اور حمام بھی توران و ایران سے آئے۔ چپاتی ایک ترکی لفظ ہے' نان' مالیدہ' نان فطیر اور نان خمیر' شوربا' نانبائی' تواد تابہ' و سپنا (دست پناہ) کفگیر اور بیسیوں دوسرے ترکی' عربی اور فارسی الفاظ اپنی اصل کا پتا دیتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اولین مغلوں کا ہندوستان ایران سے زیادہ ہرات سے متاثر ہوا۔ ہرات و بہزاد کا ہرات تھا۔ میر علی شیر نوائی (وزیر سلطان حسین بیقرا) کے زمانے کے کوائف اس دور کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اہم مجلسی مراکز تنور' حمام' کارواں سرا' مساجد و مقابر اور شیرہ خانے تھے۔ شعر گوئی اور شعر فہمی عوام تک سرایت کر چکی تھی۔ سام میرزا کی کتاب تحفہ سامی میں صدہا عام پیشہ وروں کے نام ہیں جن کی شاعری مقبول عام و خاص تھی۔ عمارتوں اور باغوں کی دیواروں پر

عمدہ شعر لکھنے کا بڑا رواج عام تھا۔ اور استادی شاگردی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ تصویروں کے البم (مرقع) بھی رکھے جاتے تھے' کتب خانے جمع کرنے کا شوق عام تھا۔ مساجد سے ملحق مدارس اور خانقاہوں کے ساتھ بڑے بڑے کتب خانے ہوتے تھے۔ علم کے لیے سفر کرنا تو پورے عالم اسلام کی محبوب روایت تھی۔

بابر وغیرہ کے ساتھ یہ اثرات ہندوستان میں پہنچے۔ بابر اور جہانگیر نے اپنی اپنی توزک میں جن جن کوائف کا ذکر کیا ہے وہ اس زمانے کے کلچر پر بڑی روشنی ڈالتے ہیں۔

باایں ہمہ مسلمانوں کے کلچر کے مخصوص مراکز چند تھے' مثلاً مسجدیں' مدرسے' اور خانقاہیں ـــ' ان میں مساواتی اصول پر میل جول ہوتا تھا۔ خانقاہوں میں جس طرح تربیت ہوتی تھی اس کے حالات حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات (فوائد الفواد) اور میر خورد کرمانی کی سیر الاولیاء میں ملتے ہیں۔ خدمت خلق' تواضع' انکسار اور بے غرضی کی جو تعلیم ان خانقاہوں میں دی جاتی تھی اس سے عام افراد کو تصفیہ قلب و تزکیہ نفس کے مواقع ملتے تھے۔

بعض لوگ تصوف کے اس سلسلے کو بیکار اور محض داخلی و انفرادی عمل سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بھول ہے۔ صوفیوں سے متاثر عوام' اس ریاضت سے گزرنے کے بعد ایک سوشل وسیلہ بن جاتے تھے باہمی روابط و معاملات میں 'خلوص' بے نفسی اور دیانت و صداقت کے پیکر ہو جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بے حد ضروری تھا۔ اسے آپ چاہیں تو روحانی انداز کا Standardization کہہ ڈالیے۔ اس نظام نے انسانوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اس سے اچھے انسانی کردار پیدا ہوتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ خانقاہوں اور سلسلوں کی کثرت سے قومی زندگی کو کچھ نقصان بھی پہنچے مگر حقیقی تصوف نے عمومی طور سے تطہیر کا کام کیا اور مجلسی آداب و اخلاق میں بے حد شائستگی اور شیرینی پیدا کی ـــ محبت اور دردمندی کی فضا صوفیوں کے دم سے قائم رہی اس کے علاوہ مسلمانان ہند نے وسیع نظام تعلیم قائم کیا۔ بڑے بڑے شہروں کے علاوہ (جن میں ہزار ہزار مدرسے ازروئے تاریخ ثابت ہیں) علما نے قصبات و دیہات میں بھی علم کی شمع روشن کی۔ دیکھیے ابوالحسنات ندوی: ہمارے مدارس' نیز سلیمان ندوی: حیات شبلی (مقدمہ) علم مسلمانوں کی نظر میں خدا کا نور ہے' اس نور کی روشنی سے خود کو منور رکھنا سب سے بڑی سعادت تھی۔ اس بنیاد پر مسلمانوں کو علم کا سچا عاشق کہہ دیا جائے تو مضائقہ نہ ہو گا تسلیم کے سلسلے میں بعض خاص رسمیں ہوتی تھیں مثلاً بسم اللہ کی رسم۔ مکتب نشینی کی رسم' قرآن ختم کرنے کی رسم۔ اور اس طرح کی کئی اور رسمیں۔ ان سب کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔

دور کی بات چھوڑیئے۔ ابھی ایک سو سال قبل 1854ء میں پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیم آرنلڈ نے پنجاب کے بارے میں لکھا کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں میں اسی (80) فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ (دیکھئے شیخ محمد اکرام: سلسلہ آب کوثر وغیرہ) مسلمانان ہند کے نظام تعلیم و تربیت پر مناظر احسن گیلانی نے اسی نام سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس سے یہ روشن ہو جاتا ہے کہ مسلمانان ہند کے کلچر میں حصول علم اور اشاعت علم ایک بہت بڑی قدر تھی۔ جس طرح ادب اور احترام انسانیت کا سبق خانقاہوں سے حاصل ہوتا تھا۔ علم کی روشنی مدارس سے ملتی تھی۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ علم اور عرفان میں خوش آئند امتزاج بھی پیدا ہوا۔

عہد مغلیہ میں 'مصوری کا ایک خاص دبستان ابھرا۔ یہ تصویر کاری بالعموم آرائش کتاب یا تشریح کتاب سے متعلق ہے۔ خطاطی اور نقاشی جو مسلمانوں کے فنون عالیہ ہیں ہندوستان میں بھی منزل کمال تک پہنچے۔ ان کے علاوہ 'علم مسکوکات' مُہر کنی' کوزہ گری' قالین بافی' پارچہ بافی' فلزکاری' غرض ہنر کی صدہا اقسام کے نمونے آج بھی دنیا کے عجائب خانوں کی رونق ہیں۔

موسیقی کا فن' ہندوستان کا اپنا فن ہے۔ مگر اس کی ترقی و فروغ میں اور اسے ایک خاص نہج پر ڈالنے کا کام مسلمان اہل فن نے کیا۔ اور خسرو سے لے کر دور آخر تک ایک طویل تاریخ اس فن کی ہے اور یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ موسیقی کو مسلمانوں میں عبادت اور فن عالی کا درجہ حاصل رہا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے خلاف اگر کچھ فضا موجود رہی تو وہ اس کے ماحول اور لوازم کے خلاف تھی۔ موسیقی از بسکہ نوعے از عبادت تھی۔ اس کے ماحول کو شراب اور اوباشی سے پاک رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ وہ صرف صوفیوں کی مجالس سماع میں بلکہ عام محافل میں بھی موسیقی اور اوباشی کے درمیان فاصلہ رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ دیکھیے کتاب معارف نغمات کا دیباچہ جس میں آداب موسیقی کا خاص تذکرہ ہے۔ قوالی (قوال) غزل 'ترانہ مسلمانوں کی خاص اختراعات ہیں اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے (دیکھئے عطیہ فیضی کی کتاب: Indian Music عمارت گری (فن تعمیر) کا مسئلہ زیادہ محتاج تفصیل نہیں۔۔۔ مسلمانوں کا فن تعمیر منفرد بھی ہے اور معروف بھی۔ اس کا متعلق عمدہ کتابیں موجود ہیں۔ عمارت کے معاملے میں عام مسلمانوں کے بھی کچھ خاص رویے تھے۔ مسلمانوں کی عمارتیں حویلی کے انداز کی ہوتی تھی۔ ان میں پردہ داری کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ دیواریں بغرض حفاظت و پردہ ضروری خیال کی جاتی تھیں ۔۔۔ مردانہ حصہ گھر سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ طہارت خانے قبلہ رخ نہ بنائے جاتے تھے۔ دیواروں میں جالیوں کا رواج عام تھا۔ اور ہر

شخص حسب استطاعت اپنے آنگن میں شجر کاری کا اہتمام کیا کرتا تھا۔

مسلمانوں کے ان انداز عمارت کا اثر' ان کے زوال سلطنت کے بعد سکھوں اور انگریزوں کے زمانے میں بھی باقی رہا۔ گنبد اور محرابوں والی عمارتیں آج بھی ان اثرات کا پتا دیتی ہیں۔

مغلوں کے آخری دور کی معاشرت کی تصویر جس نے دور دراز کے علاقوں اور صوبوں کو بھی متاثر کیا معاصر فارسی ادب و شاعری میں بتفصیل مل جاتی ہے۔ کچھ نثری کتابیں مثلاً تذکرے اور یادداشتیں (بدائع و قائع) بھی اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔ آنندرام مخلص کی کتابیں خصوصاً چمنستان اور بدائع و قائع' درگاہ قلی خان کا مرقع دہلی' فیاض الدین کی بزم آخر ـــ سید احمد کی رسوم دہلی' فرحت اللہ بیگ کے مضامین' خواجہ حسن نظامی کی کتابیں ـــ عبدالحلیم شرر کے مقالات (لکھنو کا گزشتہ تمدن) آزاد کی آب حیات اور اس طرح کے اور مآخذ میں مغلوں کے آخری دور کی معاشرت کلچر کے نقشے مل جاتے ہیں۔ اور شعرا کے تذکرے تو براہ راست ان تفصیلات کے مخزن ہیں۔

اس زمانے کے ادب سے اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس دور میں داستان نگاری اور قصہ گوئی کے فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ میں شکایتاً یہ لکھا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے سپہ گری کو ترک کر کے' بزم آرائی شروع کر دی ہے جس کے نتیجے میں مرہٹے اور دوسرے غیر مسلم غلبہ پاتے جا رہے ہیں۔ بہر حال بوستان خیال جیسی داستانیں لکھی گئیں' جن کا خاصا تتبع ہوا۔ قصہ گوئی کا فن زوال سلطنت کے بعد تک جاری رہا۔ میر باقی علی داستان گو شاید آخری بڑے داستان گو تھے۔

اس کے ہمراہ مشاعروں کا بڑا چرچا ہوا۔ یہ اسی زمانے کا اہم تفریحی اور تربیتی سلسلہ تھا ـــ فرحت اللہ بیگ کا آخری یادگار مشاعرہ اس کی ایک بھرپور تصویر ہے۔

مرثیہ گوئی ـــ اور سوز خوانی بھی وقت کی اہم ادبی مذہبی اور تربیتی سرگرمی تھی۔

شاعری کے موضوعات سے بھی معاشرتی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں ایک طومار نویس صدرالدین محمد زبردست خان تھے۔ انہوں نے وقت کے ہر موضوع پر لکھا ہے۔ ریختہ میں ایک مثنوی پن گھٹ پر' ایک تمباکو پر' ارادت خان واضح کی مثنوی در صفت زمانہ بازار' میرزا خلیل کی مثنوی زنانہ بازار دوسرے شعرا کی مثنویاں قہوہ و تمباکو کے بارے میں' ـــ میر تقی میر کی مثنویات ہوئی اور آصف الدولہ کی شادی (اردو میں) ـــ' اس کے علاوہ اسی شاعر کی مثنویات تنبیہ الجہال اور اژدر نامہ وغیرہ زمانے کی ادبی فضا کے بارے میں ـــ'

اس کتاب کے موجودہ موضوع کے لحاظ سے' اس سے زیادہ تفصیل یہاں ممکن

Marfat.com

نہیں۔ یہ محض اشارے ہیں جن سے مزید تحقیق کی رہنمائی ہو سکتی ہے۔

بڑے شہروں میں، مغل بادشاہوں کے زمانے کی رائج کردہ بعض تقریبات بڑے جوش و خروش سے منعقد ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں مغلوں کے زمانے میں جشن نوروز بڑا مشہور میلہ تھا، اورنگزیب نے ایک فرمان کے ذریعے، اسے جشن عید میں تبدیل کر دیا، بعد کے دور میں عید اور نوروز دونوں میلے جاری رہے۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے جلوس کی تقریب بھی اہم تھی۔ اس موقعہ پر بازار سجائے جاتے تھے۔ خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اور بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اب یہی لفظ جلوس سیاسی مظاہرے کے طور پر مشہور ہے۔

پرانے زمانے میں، دونوں طرح کے کھیل مروج تھے۔ اندرونی اور بیرونی۔ اندرونی کھیلوں میں شطرنج، گنجفہ اور فرد وغیرہ تھے۔ خواتین کے کھیل اکثر افادی ہوتے تھے۔ چرخہ کاتنا۔ گھر کے چولہے تنور بنانا، نقش و نگار بنانا کشیدہ کاری وغیرہ۔

سلاطین و امرا کی خواتین محدود پیمانے پر نشانہ بازی اور شکار کی تفریح بھی کرتی تھیں۔ بیرونی کھیلوں میں پہلوانی، تیر اندازی، شمشیر زنی، گھڑ دوڑ، نشانہ بازی، مردانہ رقص، تتی (کبڈی)، بیلوں کی دوڑ، (زمانہ انحطاط میں بٹیر بازی، مرغوں کی لڑائی) گتکہ، بنوٹ وغیرہ کا رواج عام تھا (تفصیل دیکھیے عبدالحلیم شرار: لکھنو کا گزشتہ تمدن)

ان تفریحی مشاغل کے علاوہ سنجیدہ مشاغل کی بھی گرم بازاری تھی۔ مجالس وعظ اور مجالس مناظرہ سے خاص دلچسپی لی جاتی تھی۔ عام خیال کے برعکس وعظ ایک بہت بڑا فن تھا۔ اس کا آغاز اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں ہو گیا تھا۔ شیخ الشیوخ حضرت عبدالقادر جیلانی ایک خاص اسلوب وعظ کے بانی تھے۔ ان کے بعد مختلف صورتوں میں سلسلۂ وعظ کو فروغ ہوا۔ رفیع واعظ قزوینی کے مواعظ ابواب الجنان میں محفوظ ہیں اور علمی عجائب و لطائف کا مخزن ہیں ——'

وعظ کاشفی کے مواعظ بھی بہت مشہور ہیں۔ اسلامی ہندوستان کے اس دَور آخر میں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے وعظ بہت مقبول ہوئے —— اس صدی کے نصف اول میں شاہ اشرف علی تھانوی کی واعظی ساحری سے کم نہ تھی۔ جن کے وعظوں کا مجموعہ اشرف المواعظ معارف کا گنجینہ ہے، فہرست طویل ہے سب کا پیش کرنا ممکن نہیں۔

وعظ میں اصل موضوع پر چند کلمات کہنے کے بعد ہر مقرر دُور دُور تک پھیل کر مختلف قسم کے لطائف جمع کر دیتا تھا —— اور انہیں اس طرح مربوط کر کے پیش کرتا تھا کہ اصل مضمون بھی روشن ہو جاتا اور بے شمار غیر متعلق معارف بھی سامعین کے علم میں آجاتے —— واعظ کے لیے خوش بیان اور خوش الحان ہونا ضروری تھا۔ اکثر واعظ اشعار (بلکہ

Marfat.com

بعض اوقات نثر بھی) ترنم سے ادا کرتے تھے۔ بیچ بیچ میں لطیفے اور چٹکلے بھی ہوتے ـــ اس طرح چار چار پانچ پانچ گھنٹوں تک محفلیں قائم رہتیں ـــ اور اس سے دلوں کا گداز حاصل ہوتا۔ واعظوں کے اس فن نے اصلاح و تطہیر کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

ہندوستان کی اٹھارھویں صدی کا آخر ـــ اور انیسویں صدی کامل مناظرے کے صدی تھی۔ اس میں ہر طرف ہر موضوع پر مناظرات کو فروغ ہوا ـــ مناظرہ زمانہ قدیم سے ایک عظیم فن رہا ہے۔ اس کی خاص تکنیک' خاص آداب اور خاص وسائل اثر آفرینی ہوتے تھے ـــ سرسید کے زمانے میں علامہ ابوالمنصور نے بڑا نام پایا ـــ ایک میلہ خداشناسی بھی بہت مشہور ہے۔ علامہ رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں' اور مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کے نام معروف ہیں ـــ اور انہیں پر کیا موقوف ہے ہر ہر بڑے شہر میں مناظر موجود تھے اور مناظرے ہر خاص و عام کے لیے ایک مجلسی سرگرمی اور مشغلے کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ مناظروں میں شدید متنازع فیہ دینی امور زیر بحث آتے تھے لیکن لوگوں کے تحمل اور بردباری کا یہ عالم تھا کہ یہ محفلیں بڑے سکون سے انجام تک پہنچتیں۔

مشاعروں کا ذکر پہلے آ چکا ہے مگر بعض اوقات عرسوں کے ساتھ بھی مشاعرے ہوتے تھے اور عرس خود بھی روحانی اور عرفی تفریح کے مواقع بن گئے تھے۔

اس صدی کے آغاز میں تھیٹر بھی عام ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے 'رہس اور سوانگ کا رواج تھا خصوصاً سلاطین اودھ کی سرپرستی میں اسے بڑا فروغ ہوا۔

ایک بات بالکل قطعی ہے کہ مسلمانوں نے مجسمہ سازی اور بت تراشی کبھی نہیں کی۔ اور سچ یہ ہے کہ بت شکنوں کے لیے بت تراشی اور بت فروشی کچھ زیبا بھی نہ تھی۔

یہ تو بعض فرنگی ذہن ہندی الاصل مسلمانوں کا تازہ ذوق ہے کہ وہ بت تراشی اور بت فروشی کرنے لگے ہیں ـــ کیا بعید ہے کہ یہ بت پرستی کی پہلی منزل ہو! اور ہندوستان کی اصنامی روح کی بیداری کا مرحلہ اول ہو۔

ہندوستان میں اسلامی کلچر کی یہ طویل (مگر پھر بھی بے حد مجمل) کہانی کم از کم یہ تو ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کا اسلوب زندگی بے ذوق نہ تھا ـــ اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہ اپنی نوعیت کے ہر طرح کے اذواق اور راحتوں سے مملو تھا۔ پھر عرض کرتا ہوں کہ یہ اذواق اپنی اور صرف اپنی نوعیت کے تھے۔ ان کا یورپین ہونا ضروری نہیں جیسا کہ بعض مغرب زدہ حضرات توقع رکھتے ہیں ـــ قوم اپنے جغرافیے اور اپنے عقائد و اقدار کے تحت زندگی کی روش متعین کرتی ہے۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کا کلچر (تہذیب و تمدن) اپنی نوعیت رکھتا تھا۔ اس

Marfat.com

میں...... ذوقِ عبادت و خدمت ' ذوقِ جہاد ' ذوقِ علم اور ذوقِ راحت...... یہ چاروں اذواق جمع تھے۔ بہر حال جینے اور زندگی کو خوش خوش گزارنے کے سب ڈھنگ موجود تھے مگر یہ سب کچھ بااصول تھا— کچھ ضابطے بھی تھے جو ہر حال (مجموعی طور سے) مد نظر رہتے تھے۔

اسلامی ہندوستان کے کلچر کی تہ میں کار فرما چند عقیدے اور چند افکار تھے۔ اور یہ عقیدے دور عروج میں بڑی قوت کے ساتھ (اور بعد میں بھی کبھی کم کبھی کافی) موجود رہے!

سب سے اہم عقیدہ توحید ہے۔ اس عقیدہ نے مسلمانوں میں دو طرح کے رویے پیدا کیے۔ ایک طرف وہ بے خوفی جو غیر اللہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ دوسری طرف تمام مخلوق کو خدائے واحد کی عیال سمجھنے کا رویہ— اس سے شفقت علی الخلق اور مساوات کا عمل ابھرا—

دوسرا عقیدہ صلح و سلام ہے۔ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ نباہ کا تجربہ۔ اسلام ذہن کے لیے انوکھا تھا— مسلمانوں نے جس خوش اسلوبی سے اس اکثریت کے ساتھ نباہ کیا یہ ان کے اسلوب زندگی کی عظیم فتح تھی— انہوں نے اپنے دور میں جبر کے اصول پر عمل نہیں کیا۔ ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد بھی ' غیر مسلم غالب اکثریت میں رہے۔ اور حاکم مسلمان معمولی اقلیت میں یہ عقیدہ صلح و سلام کا کرشمہ تھا۔

تیسرا مظاہرہ اس کلچر کا امتزاجی انداز ہے ' اس میں ایک طرف قبل از مغلیہ دور کے تورانی ذہین جستجوئے عظمت ہے تو دوسری طرف دور کے ایرانی ذہن کی تخیل پسندی اور نفاست پرستی بھی ہے— اور اس میں ہندی راجپوتی ذہن کے اثرات جب شامل ہوئے تو ان سب سے ایک عجیب و غریب کلچر نمودار ہوا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں اردو فارسی کے ہندو شعرا— اور ہندی (اور گاہے سنسکرت) کے عالم اور شاعر مسلمانوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

چوتھی خصوصیت اس ہندی اسلامی کلچر کی ' جذب و تسخیر ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ ہندوستان میں حکمران مسلمان بے اندازہ اقلیت میں تھے اور غیر مسلم بے پناہ اکثریت میں اگر مسلمان سلاطین بزور شمشیر اس اکثریت کو مسلمان بنانا چاہتے تو ملک کی یہ اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو سکتی تھی لیکن انہوں نے شمشیر کو استعمال نہیں کیا۔ یہ کام صوفیہ و عرفا کے جذب و تسخیر نے کیا۔ ایک ایک مرکز میں ایک ایک خانقاہ نے ماحول کو متاثر کیا۔ لاہور میں داتا صاحب نے ' پاکپتن میں بابا فرید شکر گنجؒ نے ' دہلی میں نظام الدین اولیاؒ نے ' اجمیر میں حضرت چشتیؒ نے ' جنوب میں شاہ راجو قتالؒ نے اسی طرح پورب اور بنگال میں قدم قدم پر

Marfat.com

ان خانقاہوں نے۔ اوران کے زیر اثران کے عام پیروؤں نے اپنے کرداراور محبت سے اس ملک کے عوام کو متاثرو مسخر کیا۔

پانچویں خصوصیت اس کلچر کی وہ ذوق زندگی تھا جس سے خواص سے لے کر عوام تک سب بہرہ ور ہوئے۔ عام طور سے لوگ رسوم کے خلاف لکھتے ہیں لیکن بعض مخرب اخلاق اور خلاف انسانیت رسوم کو چھوڑ کر باقی رسوم تو زندگی کو گوارااور باثروت بنانے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

مسلمانوں نے عرف اور عادت کو دنیا کے ہر ملک میں گوارا کیا ہے۔ اسلام میں (عرف عربی) کاایک صالح عنصر خود بخود جذب کر لیا گیا تھا...... اس کی مثال پر دنیا کے ہر ملک کے عرف وعادات کو (صحت مند ہونے کی شرط پر) اسلامی معاشرت کے اندر جگہ ملتی رہی۔

اس اصول کے تحت ہندستان کی اسلامی معاشرت میں صحت مند مقامی عرف و عادت کو حوصلہ شکنی نہیں ہوئی جس کے باعث بے شماروہ تفریحات وذوقیات جو صدیوں سے چلے آتے تھے مسلمانوں میں بھی رائج رہےاور ذوق عامہ کی تسکین و تفریح کا باعث بنتے رہے۔

ہندی اسلامی کلچر (شاید سارے اسلامی کلچر) کے بارے میں دو متخالف انتہا پسندانہ خیالات ایسے ملتے ہیں جنہیں خطرناک ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اسلامی زندگی گھٹن اور گلو گرفتگی کا دوسرا نام ہے—' مذکورۂ کوائف سے اس تاثر کی از خود تردید ہو جاتی ہے۔ اسلامی ہندی معاشرہ (اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود) ہمیشہ فرحت افزا رہا ہے جس میں جسم وروح کی جملہ معتدل صحت راحتوں کے لیے پورا موقعہ ملتا رہا۔ بلکہ بعض اوقات کچھ یوں لگتا ہے کہ رندی وپارسائی کے مابین اتنی صلح صفائی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسلامی ہندی معاشرے میں صلح و جنگ کی بھی یہی کہانی نظر آتی ہے—زاہداور خوش باشی دست بدست چلتے نظر آتے ہیں۔ انسانی مجبوریوں کی سطح پر' شاید بھرپور زندگی اسی کا نام ہے۔

یہ سمجھ لینا کہ اس معاشرے کے سب لوگ اچھے تھے بالکل غلط خیال ہو گا۔ ہر زمانے کی طرح پرانے زمانے میں بھی اچھے برے سب قسم کے لوگ موجود تھے[133] لیکن یہ واضح ہے کہ جو برے تھے وہ برائی کو بہر حال برائی ہی سمجھتے تھے جس کے باعث اصلاح اور بازگشت کی پوری گنجائش ہوتی تھی آج کل کے برعکس کہ برائی کو برائی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے حق میں علمی و منطقی دلیلیں دی جاتی ہیں۔

اور یہ سمجھ لینا بھی غلط ہو گا کہ اس زمانے کے سب لوگ بُرے یا بد ذوق اور بے کیف

Marfat.com

تھے۔ غزل کی دلدادہ قوم کبھی بے کیف نہیں ہو سکتی۔ اور نیکی میں یقین رکھنے والے لوگ مستقلاً برے بھی نہیں ہو سکتے۔

ختم کرنے سے پہلے ایک اور نکتے کا اضافہ مفید ہوگا۔

یہ یاد رہے کہ ہندی اسلامی کلچر کا ایک اخلاقی مزاج تھا۔ یہ اخلاقی مزاج تین اطراف میں ظاہر ہوا۔ اس زمانے کی تعلیم و تربیت کے زیرِ اثر ایک ذائقہ وہ تھا جو عطار، سعدی اور دوسرے شعرا کی اخلاقی شاعری اور پند ناموں سے تشکیل پذیر ہوا ـــ سعدی ہندو پاکستان کے اخلاقی مزاج پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہوئے۔ ان کی علمی دانش اور شرافتوں کی معیار شناسی نے متوسط پڑھے لکھے آدمی کو متاثر کیا۔

دوسرا ذائقہ لسان الغیب حافظ کے کلام سے پیدا ہوا ـــ یہ رنگ بہت تیز رہا۔ اور آج ہمارے مزاجوں میں موجود ہے۔ اس میں بے ثباتی کے لطیف غم کے ساتھ ساتھ سرشاری و مدہوشی کا عنصر موجود ہے۔

تیسرا ذائقہ مولانائے روم کے اثرات نے پیدا کیا مولانائے روم ان بزرگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی شورش و مستی مدہوش کرنے والی نہیں بلکہ بیدار کرنے والی ہے۔ رومی ہر اس زمانے میں مقبول ہوئے جب قوم کو ناموافق حالات نے سوچنے پر مجبور کیا۔ (ملاحظہ ہو میرا مضمون: مطالعۂ رومی کی تحریک میں اقبال کا مقام' در مسائل اقبال)

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں۔ جسے ساقی ناموں کا دور کہنا چاہیے (ملاحظہ ہو مے خانہ ملاّ عبدالنبی) حافظ کا کلام بے حد مقبول تھا مگر دور شاہجہانی کے نصف آخر میں نواب شکر اللہ خاکسار اور عاقل خاں رازی وغیرہ مثنوی رومی کی تحریک کو پھر سے مقبول بناتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے رومی کی کئی شرحیں لکھی جاتی ہیں۔

بااین ہمہ حافظ کی رنگینی و سرشاری کا نقش موجود رہا جس کے کچھ برے اثرات بھی نمودار ہوئے اس کو دیکھ کر اورنگ زیب نے ایک فرمان کے ذریعے مثنوی رومی کے درس کو (دیوان حافظ کے بجائے) لازمی قرار دیا۔

بہر حال یہ تینوں ذائقے' دانشور طبقے میں موجود رہے جس کا اثر کچھ کچھ آج بھی موجود ہے اسلامی ہندی کلچر کی یہ روداد سرسری ہے' اس پر کئی جلدیں لکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے یہ میری موجودہ کتاب کی حد تک کافی ہے۔

Marfat.com

ساتواں باب

اثراتِ فرنگ کا دَور

عالم اسلام میں فرنگی اثرات کا آغاز اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یہ لہر ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز میں پہنچی۔ لیکن اس میں شدت انقلاب دہلی 1857ء کے بعد پیدا ہوئی جب انگریزی تعلیم کے پیچھے پیچھے انگریزی معاشرت نے بھی متاثر کرنا شروع کیا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی مناظرے کی صدی تھی' ہر قسم کے موضوعات مابہ النزاع تھے لیکن سب سے اہم مناظرہ وہ تھا جو انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں برپا ہوا۔ علم و تعلیم کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ یہ ان کا حصول کسی طرح بھی ناپسندیدہ ہو سکتا ہے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اسی وجہ سے 'اب وہ پرانی غلط فہمی رفع ہوتی جارہی ہے کہ کسی گروہ نے محض علم و تعلیم کی یا انگریزی پڑھنے کی مخالفت کی۔

دراصل اس وقت دو اہم مسئلے مدنظر تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ انگریزی حکومت کو اس کے سارے نظام کے سمیت تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس میں انگریزوں کا لایا ہوا نظام تعلیم بھی شامل تھا۔ ایک گروہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور انگریزوں کی حکومت سے مفاہمت کی کسی شکل کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا جبکہ دوسرا گروہ مفاہمت پسند تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ انگریزی نظام تعلیم محض انگریزی پڑھنے کا معاملہ نہیں اس میں انگریزی معاشرت (بلکہ اس زمانے میں مسیحی خیالات) کا اثر قبول کرنے نہ کرنے کی بحث بھی آ گئی تھی خصوصاً جبکہ اس عہد میں عیسائی مشنری انگریزی حکومت کی حمایت کے بل بوتے پر اسلام پر مناظرانہ حملے کرنے مصروف تھے۔

بہر حال انگریزی تعلیم کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اس

"کرسٹان کلچر" کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک میں پھیل رہا تھا یا پھیلایا جارہا تھا۔

اور اس مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان کو اپنی معاشرت کے شعائر کو مقدس مانتے تھے کیونکہ ان کی اساس اسلامی عقیدوں پر تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی مد نظر تھا کہ دوسروں کی معاشرت کی تقلید کا مطلب ان کے غلبے کو تسلیم کرنے کے مترادف اور اپنی معاشرت کے حقیر اور غیر معیاری مان لینے کے برابر ہوگا۔ اور یہ انگریزوں کے تسلط کو مستحکم کرنے کا باعث ہوگا۔ اور دوسروں کی معاشرت اختیار کرنے کے بعد ذہن فرنگی (مغربی) اور عقیدے غیر اسلامی ہوتے جائیں گے ـــ اور یہ معلوم ہے کہ معاشرت ہی کسی قوم کے عقیدوں کا خارجی اور تعارفی اور قطعی روپ ہوتی ہے۔ جب کسی مذہب (قوم) کا اپنا معاشرتی اسلوب ختم ہو جاتا ہے تو وہ مذہب بالآخر محض خیالی سی رسم بن کر عملاً بے جان اور مردہ ہو جاتا ہے غرض اٹھارھویں صدی کا تعلیمی مناظرہ در اصل معاشرتی مناظرہ تھا۔ انگریزوں کے ہوا خواہ مؤرخوں..... اور کرسٹان کلچر کے دلدادہ مصنفوں نے اسے دانستہ برے رنگ میں پیش کیا اور کہا کہ پچھلی صدی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے علم اور تعلیم کی مخالفت کی۔ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے کہ یہ مخالفت علم و تعلیم کی نہ تھی بلکہ انگریزوں کی معاشرتی یلغار اور انگریزی استعمار کے رسوخ کے خلاف احتجاجی تحریک تھی۔ یہ ان متوقع خطرات و مضرات کے خلاف ایک طرح کی آگاہی تھی۔ خصوصاً اس امر کی نشاندہی تھی کہ اس کے زیر اثر مسلمان اپنے کلچر کو ترک بھی کر دیں گے اور اسے برا بھی سمجھنے لگیں گے۔ غیروں کی معاشرتی نقالی پر فخر کیا کریں گے اور اپنے سارے نظام زندگی کی تحقیر کر کے۔ اسے درہم برہم کرنے پر تُل جائیں گے۔

اس واقعہ پر تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے۔ اور اب اس بارے میں کسی ثبوت کی حاجت نہیں رہی کہ پچھلی صدی کے بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ نکلا۔ ان کی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب استدلال کی بنیاد ہی بدل دی گئی ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ اس معاشرت کو کے فیوڈل معیشت کی پیداوار تھی بدلنا ہی چاہئے تھا۔ مگر یہ دلیلیں آج کے مغرب زدہ بلکہ مغرب کشتہ طبقے کی ہیں۔ اس وقت تو سب "رخ بہ مغرب" بزرگوں کی دلیل یہ تھی کہ مغربی تعلیم سے ہماری معاشرت کو کچھ نقصان نہ پہنچے گا اور اسلام اور اس کی اقدار کو تقویت ہوگی۔ شاید یہ باتیں وہ بزرگ نیک نیتی سے کہتے تھے مگر اس سے ان کی بے بصیرتی کا راز تو فاش ہو ہی جاتا ہے۔

جن بزرگوں نے اس موقف کے خلاف کہا اور لکھا اس میں اکبر پیش پیش تھے۔
اس حکیم عصر نے جو کچھ کہا تھا وہ سب سچ نکلا۔ اس کی شاعری مرقع بصیرت اور سفینۂ عبرت ہے۔ اکبر کے علاوہ شبلی، محسن الملک، اسمٰعیل میرٹھی نے بھی اپنے اپنے انداز میں متنبہ کیا۔۔۔بلکہ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی کہ ان کی کتاب ابن الوقت اسی انقلاب معاشرت کی آئینہ دار ہے، دبی زبان سے اس معاشرتی اختلال پر خوف کا اظہار کیا۔

ایک نئے مصنف نے اپنی کتاب میں بیسویں صدی کے ترکوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ انہیں اپنی تہذیب کے اعلیٰ ہونے کا بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ اس پر فخر کرتے تھے اور خود کو یورپ سے معاشرتی طور سے برتر سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے مغرب کا معاشرتی (سیاسی) اثر ذرا دیر سے پھیلا۔

ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اپنی تہذیب پر ناز تھا۔ اور مغل اسلامی ہندی تہذیب کوئی حقیر شے بھی نہ تھی لیکن انگریزی اقتدار کی حمایت کے بل بوتے پر مغرب زدہ طبقے نے اسے مسلمانوں میں پھیلا کے چھوڑا اور اس میں عیسائی مشنری طبقے نے بھی بڑا حصہ لیا اس لیے اس زمانے میں مغرب زدگی "کرسٹان کلچر" کی پہلی منزل تھی۔

علی گڑھ کی تحریک بنیادی طور پر تعلیمی تھی لیکن چونکہ انگریزی میں نئی تعلیم نئی معاشرت کی پہلی سیڑھی تھی اس لیے ہندوستان میں مغربی معاشرت کی پہلی تربیت گاہ یہی درس گاہ تھی۔ علی گڑھ کی تعلیمی خدمات سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن معاشرت کے میدان میں علی گڑھ کے راستے سے جو اختلال پیدا ہوا اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اکبر آلہ آبادی کے تبصروں کو اگر ایک مخالف کیمپ کے آدمی کا مخالفانہ و متعصّبانہ عمل بھی سمجھ لیا جائے تو محسن الملک کو تو کسی طور علی گڑھ تحریک کے مخالفوں میں شامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ سرسید مرحوم کی وفات کے بعد مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سیکرٹری ہوئے اور سید مرحوم کی زندگی میں ان کے سب سے بڑے رازدار اور دوست محسن الملک ہی تھے۔ اب محسن الملک کی رائے دیکھیے جس کا اظہار انہوں نے سیکرٹری بننے کے بعد رسالہ تہذیب الاخلاق میں کیا۔

یہ حالت اسی وقت ہو گئی تھی جب کالج کی عمر تیس بتیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد تو یہ دروازہ کھل گیا او تحریک خلافت کے تھوڑے سے وقفے کے سوا بیسویں صدی میں مسلسل کھلتا گیا تا آنکہ اب مغربیت مسلمانان ہندو پاکستان کا مستقل نصب العین ہے جس کے بہت سے خوبصورت نام رکھ لیے گئے ہیں ان میں جدیدیت اور زمانۂ حاضرہ کے تقاضے کی اصطلاحیں نہایت مقبول ہیں۔

Marfat.com

راقم الحروف نے گزشتہ صفحات میں بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کسی مذہب کا خارجی ظہور صرف معاشرت کی شکل میں ہوتا ہے گویا مذہب کی عملی شکل معاشرت ہی ہے خصوصاً دین اسلام میں جو عقائد عبادت اور معاشرت کا مجموعہ ہے نئی تعلیم کے ساتھ جو معاشرت آئی اس نے اسلام کے معاشرتی حصے کو مسخ اور برباد کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد مغرب سے آمدورفت اور دیگر روابط کی وجہ سے یہ سلسلے اور بھی محکم ہو گئے۔ قیام پاکستان تک مغربی معاشرت اختیار کرنے میں جو جھجک تھی نئی مملکت کے ظہور میں آنے کے بعد وہ بالکل دور ہو گئی...... اور اب تعلیم یافتہ کا قبلہ مقصود یہی مغربیت ہے اور عوام قدرے اپنی پرانی ڈگر پر بے مقصود چل رہے ہیں مگر ان میں سے بیشتر کا رخ اسی طرف ہے چنانچہ مالی لحاظ سے جس جس کو جتنی جتنی آسودگی نصیب ہوتی جاتی ہے۔ اتنا اتنا ہر شخص مغربی معاشرت اختیار کرتا جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کے لیے ہمارے ادب کے بیشتر حصے کے علاوہ' حکام کا طرز عمل' سینما' ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ بھی ذمے دار ہیں اور اب درس گاہوں کا ماحول بھی اس اختلال معاشرت میں شریک غالب ہے جہاں بہت سے اساتذہ اور طلبہ' روایت کی شکست اور احساس ماضی کو توڑنے میں ''مشنری جوش'' کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اور ان رجحانات کا نام نئی اقدار رکھ دیا گیا ہے۔

Marfat.com

آٹھواں باب

تحریکِ پاکستان کے ثقافتی محرکات

اس سے قبل قائداعظم کا یہ ارشاد آچکا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک مستقل قوم ثابت کرتے ہوئے یہ دلیل بھی پیش کی تھی کہ مسلمان مذہب کے علاوہ بربنائے ثقافت (کلچر) بھی ہندوؤں سے الگ قوم ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں ہندو اپنے روحانی رشتے داروڑی اور آریائی طرزِ معاشرت سے جوڑتے ہیں اور اسی پر فخر کرتے ہیں وہاں مسلمان، معاشرت اور کلچر کے اسلامی نقش سے ممتاز ہیں۔ اور ان کے لیے دراوڑی اور آریائی معاشرتی سرچشمے سرمایۂ فخر یا وجہ امتیاز نہیں۔ ہندوستان کی مقامی معاشرت کے وہ حصے جو تاریخی ارتقا میں سے گرتے ہوئے عہدِ اسلامی تک پہنچے اور جن پر اسلامی عقیدے نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور اختیار کر لیا بطور تقدیس یا بطور سرمایہ فخر نہیں لیے گئے بلکہ عملی مواد کے طور پر عملی زندگی کی تسہیل کے طور پر لیے گئے۔ لہٰذا ہندو کلچر اور مسلم کلچر کو الگ الگ حقیقتوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ لیکن اب کچھ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اس لیے قائداعظم اور اقبال کے اس دعوے کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ پاکستانی کلچر کی بحث میں دراوڑی، آریائی تہذیبوں کے حوالے سے مسئلہ بہت الجھ گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اگر آج قائداعظم اور علامہ اقبال زندہ ہوتے اور ان سے دریافت کیا جاتا کہ جناب کے تصور میں ہندی اسلامی یا پاکستانی کلچر میں قبل از تقسیم کی تہذیبوں کی کوئی اہمیت یا تقدیس ہے؟ تو ان کا جواب یقیناً نفی میں ہوتا کیونکہ اسلام کا تصور زندگی بالکل منفرد ہے لہٰذا اس کا تصور کلچر بھی مختلف ہے مسلمان جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ ایک نیا نظام فکر و احساس اپنے ہمراہ لائے۔ اس نئے نظام فکر و احساس نے پچھلے احساسات بدل ڈالے عہد اسلامی سے پہلے جو کچھ گزرا وہ اس خطے کی تاریخ ہے جسے مسلمانوں کے مقدس ورثے کی حیثیت حاصل نہیں۔ ہر چند کہ اس موضوع پر علامہ اقبال کے فاضلانہ ارشادات بھی موجود ہیں لیکن تشکیک کا سلسلہ

Marfat.com

جاری ہے۔ میں نے اس باب میں انہیں بزرگوں کے افکار کی تشریح کرتے ہوئے تعبیر و تحقیق کے کچھ نئے زاویوں سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے محرکات میں کلچر (تہذیبی و تمدنی) مسئلہ بھی شامل تھا یا نہ تھا؟ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔

قائداعظم نے یکم جولائی 1942ء کوایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو بیان دیتے ہوئے خود فرمایا تھا کہ "ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ معاشرتی طور طریقوں رسوم ورواج' زبان وادب' فنون لطیفہ' نام ونسب' شعور اقدار و تناسب' قانون واخلاق' تاریخ وروایات' رجحان ومقاصد کے لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات ہے۔"

مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے مسلمان از ابتدا ہندوؤں سے الگ قوم تھے۔ صرف عقائد مذہب ہی کا فرق انفرادیت کا باعث نہ تھا۔ صرف توحید ورسالت' اور ارکان خمسہ کی بنا پر ہی مسلمان ہندوؤں سے جدا قوم نہ تھے بلکہ ان کی کل معاشرت اور فلسفہ حیات بھی ان سے مختلف تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے فرمایا۔

"اسلام کے قومی تصور اور ہندو دھرم کے سماجی طور طریقوں کے باہمی اختلاف کو محض وہم وگمان بتانا ہندوستان کی تاریخ کو جھٹلانا ہے' ایک ہزار سال سے ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسری سے دوچار ہیں' یہ دونوں قومیں آپس میں میل جول رکھتی چلی آئی ہیں مگر ان کے اختلافات اسی شدت سے موجود ہیں" (اجلاس مسلم لیگ لاہور 23 مارچ 1940ء)۔

اسی موقعہ پر انہوں نے مزید کہا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ در حقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق نہیں کر سکتے۔"

اسی دلیل کی بنیاد پر انہوں نے کہا کہ "مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے' وطن نہیں اور نہ ہی نسل ـــــ ہندوستان کا پہلا فرد جب مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہ رہا ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔" (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 8 مارچ 1944ء)

ان اقتباسات سے روشن ہے کہ قائداعظم نے اپنے نظریہ پاکستان کی توضیح کے وقت معاشرتی (تہذیبی و تمدنی) بنیادوں پر بھی مسلمانوں کو ایک الگ قوم ثابت کیا ـــــ اور اس

Marfat.com

میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ واضح انفرادیت اور قطعی فرق ہی کسی الگ قومیت کے لیے کافی جواز بن جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ دوسرے سیاسی و معاشی وجوہ بھی موجود تھے۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اسلام عقائد کی داخلی صورت اور خارجی معاشرتی عمل میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ اسلام نے ایک واضح معاشرتی دستورالعمل دیا ہے جس کے تحفظ کے لیے ہر دور کے مجددین و مصلحین کوشاں رہے۔ ہندوستان میں بھی ایک واضح معاشرتی عمل ہمیشہ موجود رہا اور شیخ مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ صاحب اور صدہا دوسرے علما و فضلا نے اس نقش کو آلائشوں سے پاک کرنے پر بڑی توجہ صرف کی چنانچہ رد بدعت کی ساری تحریکوں کا یہی مقصد تھا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان میں اس جدا معاشرتی احساس نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اس دو قومی نظریے کے بارے میں بڑی تشکیک پیدا کی گئی اور طرح طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ سارا مسئلہ معاشی اور قدرے سیاسی تھا معاشرتی و تہذیبی نہ تھا۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ معاشی اور سیاسی عدم توازن بھی کارفرما تھا...... لیکن بالآخر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ ہندو، مسلمانوں کے خلاف معاشی اور سیاسی ناانصافی کیوں کرتے تھے؟ کیا اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے سے جدا قوم سمجھ کر ان سے تفاوت برتتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ اظہار بیگانگی بربنائے مذہب بھی تھا اور بربنائے معاشرت بھی۔

مسلمان تقریباً نو سو سال ہندوستان پر حکمران رہے، اس سارے عرصے میں ہندو عوام نے مسلمانوں سے معاشرتی میل جول پیدا نہ کیا۔ مغلوں کے دور تک انہوں نے مسلمان حکمران کی ملازمت سے بھی اجتناب کیا۔ مغلوں کے زمانے میں اکبر نے انہیں قریب لانے کی کوشش کی اور ملازمتوں کی ترغیب دی مگر انہوں نے چھوت چھات اور احساس علیحدگی کو برقرار رکھا۔ اور جب مغلوں کی مرکزیت میں زوال آیا تو ہندوؤں کا جذبۂ علیحدگی مخاصمت میں بدل گیا۔ ان کے ایک مؤرخ سبحان رائے بٹالوی (مصنف۔ خلاصۃ التواریخ) اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (مصنف بساط الغنائم) صاف صاف زہر چکانی کرتے نظر آتے ہیں...... اور انگریزی دور کے طلوع پر ہندو اہل قلم اور ان کی سیاسی اور مذہبی جماعتیں تو بالکل عریاں ہیں۔

جو لوگ قیام پاکستان کیلئے کوشاں تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ متحدہ مملکت ہند میں ہندو اکثریت کا راج ہوگا اور ظاہر ہے کہ سیاسی اکثریت کا غلبہ زندگی کے ہر شعبے پر اثرانداز ہوا

Marfat.com

کرتا ہے — قائداعظم کا یہ خدشہ بجا تھا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کی معاشرت و ثقافت کے انفرادی نقش کو کہیں مٹا نہ دے اور دنیا کے واقعات کو دیکھ کر' یہ خدشہ بے جا بھی معلوم نہیں ہوگا۔

تو کہنا یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے معاشی اور سیاسی تفاوت کی بنا بھی تو مذہبی اور معاشرتی تھی — آزادی کی تحریکوں کے وقت کانگریس وغیرہ کی طرف سے صلح جوئی اور ہم قومیت کا نعرہ اس مصلحت کے تحت تھا کہ مغرب کے جمہوری تصورات کی روشنی میں حکومت اکثریت (ہندوؤں) کے ہاتھ میں آرہی تھی — ورنہ پوری تاریخ میں ہندوؤں نے کسی سے "ہم قومی" کا اظہار نہیں کیا۔

ہمارے ملک کے بعض اہل فکر جو مذہبی بنیادوں پر کسی قومیت کو استوار کرنے کے حق میں نہیں' اس معاشرتی فرق کو اہمیت نہیں دینا چاہتے — ان کا دعویٰ ہے کہ اس ملک کے مختلف علاقوں کی معاشرت جدا ہے اور ان میں علاقائی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت ہمیشہ ایک رہی اور اب بھی ایک ہے۔

اگرچہ یہ حضرات مذہب کو قومیّت کی بنیاد نہیں مانتے لیکن اس امر سے وہ انکار نہ کر سکیں گے کہ قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کی اکثریت کی معاشرت ہندوؤں کی اکثریت کی معاشرت سے جدا تھی بلکہ بھارت میں اب بھی جدا ہے۔ ان میں جزوی اشتراک ہو سکتا ہے مگر عمومی میلانات جدا ہیں۔ بلاشبہ انگریزوں کے آنے کے بعد انگریزی دان طبقے میں دونوں قوموں کے بعض ظاہری طور طریقے' مثلاً لباس اور فیشن ایبل زندگی میں دونوں کے اسالیب یکساں طور سے فرنگی ہوتے گئے اور اب بھی ان میں یکسانی ہے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی وسیع اکثریت معاشرت میں کل بھی جدا تھی اور آج بھی جزوی اشتراک کے باوصف جدا ہے ان دونوں قوموں کی معاشرتوں کے پیچھے' ان کے مذہب تھے اور ہیں جن کے زیر اثر ڈھلے ہوئے اسالیب مستقلاً جدا رہیں گے۔

جیسا کہ قائداعظم نے فرمایا تھا: "ان دونوں قوموں کے مابین شادی بیاہ نہیں' ان کے عوام آپس میں مل کر بلا تکلف کھانا نہیں کھا سکتے — ' ہندو اپنے سوا سب کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ خدا و رسولؐ ہی جدا نہیں بلکہ شخصی قانون جدا ہیں' رسوم و رواج جدا ہیں — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخی پس منظر بھی جدا' فلسفۂ حیات اور مقاصد اور نصب العین بھی جدا — ذوق و مشروب بھی جدا ہے۔"

تعصب یہ ہے کہ دو قومی نظریے کے مخالف موجودہ صوبہ سرحد' پنجاب' سندھ

Marfat.com

اور بلوچستان جہاں سب کے سب مسلمان بستے ہیں الگ الگ معاشرتی تہذیبی منطقے قرار دے کر انہیں الگ الگ قومیں اور قومتیں قرار دے رہے ہیں حالانکہ ان منطقوں میں ماحول کے معمولی فرق کے باوجود' مشترک اسلامی نقش معاشرت نمایاں ہے___ ' مگر یہی لوگ اتنے بڑے معاشرتی تفاوت کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں موجود ہے اور تھا نظرانداز کر کے ہندو مسلم کو دو جدا معاشرتی منطقے قرار دینے سے گریز کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس عظیم معاشرتی فرق کے باوجود ہندو اور مسلمان ایک قوم ہو سکتے تھے غیر عقلی منطق اور غیر مربوط قیاس کی اس سے بدتر مثال کہیں نہیں ملے گی___

بیسویں صدی کی تاریخ اقوام یہ بتاتی ہے کہ تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے اتنے وسیع تفاوت کے ہوتے ہوئے کسی جگہ کے مختلف طبقات میں ایسی یکجہتی کہیں ظہور میں نہیں آئی جو ان مختلف المعاشرت طبقوں کو ایک قومیت پر رضامند کر سکتی۔

بلقان کی مثال ہمارے سامنے ہے' جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہے' اور اب انگلستان اور آئرلینڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور تازہ ترین یہ ہے کہ کینیڈا میں فرانسیسی طبقہ اس بنا پر جدا تشخص کا علمبردار ہے کہ اختلاف نسل کے علاوہ اس کا ذوق و مشرب' وہاں کے دوسرے طبقات سے جدا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دو قومی نظریے میں قائداعظمؒ نے جس تہذیبی و معاشرتی عنصر کا ذکر کیا تھا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بالکل ممکن تھا کہ مذہب و معاشرت کے اس فرق کے باوجود' مسلمانان ہندوستان ایک مملکت ہند میں ایک شریک کی حیثیت سے شامل ہو جاتے لیکن ہندوؤں نے سیاسی طور سے مفاہمت نہ کی اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر یہ مفاہمت ہو بھی جاتی تو معاشرتی و تہذیبی اختلاف اسے دیرپا نہ بننے دیتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اتحاد کے بعد جدائی کے اسباب معاشرتی ہوتے لیکن دوبارہ جدائی کی بنیاد پھر انہیں معاشرتی و تہذیبی اختلافات پر ہی رکھی جاتی تھی___ کیونکہ یہ بے حد نمایاں ہیں اور اتنے کھلے ہیں کہ چار منٹ کی ملاقات ہی ان کے ظہور کیلئے کافی ہے۔ غور فرمائیے کہ ان کے کھانے پینے کے آداب مختلف' سلام' کلام کے طریقے مختلف' تواضع کی رسمیں مختلف' سب کچھ مختلف___'

بڑی بات یہ ہے کہ تاریخ کے ہیرو مختلف ہیں' ہندوؤں کے ہیرو اشوک' بکرماجیت' چندرگپت' مسلمانوں کے ہیرو خالدؓ بن ولید' صلاح الدین ایوبی' جلال الدین خوارزم شاہ' طارق اور سلطان محمد فاتح وغیرہ۔

Marfat.com

یہاں تک خیریت سمجھئے مگر جہاں ایک کا ہیرو دوسرے کا تاریخی دشمن ٹھہرتا ہے۔ وہاں صورت حال خطرناک ہو جاتی ہے۔ محمد بن قاسم' محمود غزنوی' شہاب الدین غوری' بختیار خلجی' اور نگزیب کا نام سنتے ہی' ایک ہندو مخاطب چڑ جاتا ہے اور سیوا جی اور بندا بیراگی کے نام ایک مسلمان کیلئے ناپسندیدہ نام ہیں۔

اور سچ پوچھئے تو عہد اسلامی کی پوری تاریخ ہند' ہندوؤں کیلئے (اگرچہ بے جا طور سے) باعث توحش ہے۔

یہ تو رہا قصہ تاریخ کا...... اب ذرا ذوق و مشروب کی بات سنیئے اور یہ ذرا باریک بات ہے۔ آغاز اس کا فن تعمیر سے کیجئے۔ مسلمانوں کا تعمیری ذوق وسعت اور خارجی عظمت کا شائق ہے۔ اور ہندوؤں کا فن تعمیر تنگی' گھاپن اور داخلی تہ بہ تہ پیچیدگی کا (مثلاً مندروں کے اندر کا منظر دیکھئے) مسلمانوں کی تعمیرات میں (Symmetry) پر زور دیا جاتا ہے ہندوؤں کی تعمیر میں مخروطیت اور کلس نمایاں ہے۔ مسلمان مثبت کاری میں ذوق کا اظہار کرتے ہیں ہندو بتوں کی تصویر کاری اور مجسمہ سازی سے محظوظ ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی موسیقی توانائی میں اعتقاد رکھتی ہے۔ ہندو موسیقی غم اور یاس کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ادب وقائع عظیمہ کے ارد گرد گھومتے ہیں اور عہد بہ عہد تاریخ بناتے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے ادب میں مہابھارت پر تاریخ انسانی کا اختتام ہے۔ اور ان کے فنون میں تاریخ ندارد۔

مسلمان اپنے علوم میں محسوس کو زندہ کرتے ہیں ہندو تجریدی علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا معیار عمل ہے۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا معیار وہم و خیال ہے۔ مسلمانوں کی غایت یہ ہے کہ نیکی کو ساری دنیا میں پھیل جانا چاہیے۔ اس لیے کائنات کی تسخیر مسلمانوں کی غایت ہے۔

ہندوؤں کی نظر داخلی اور ہندوستان کے حدود تک درون بین ہے۔۔۔ قدیم ہندو سمندر کے سفر کو حرام سمجھتے تھے۔ ان کی غایت اپنے اندر سمٹنا ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کی تقریباً ہر نسل سے دو چار ہو کر اس پر اپنا اثر ڈالا۔

ہندوؤں کے نزدیک ہر دوسری قوم اجنبی اور ملیچھ ہے' یعنی ہندو تداخل افکار کے مخالف ہیں۔ اور مسلمان رب المشارق و المغارب کے حکم کے تحت سیروا فی الارض اور فانتشروا فی الارض پر ایمان رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ فرق معمولی نہیں اور ایسے ہیں جنہیں نہ مٹنے والا فرق کہنا چاہیے۔

Marfat.com

کیا ان کے ہوتے ہوئے ہندو اور مسلم صحیح معنوں میں ایک قوم بن سکتے تھے؟

جواب نفی میں ہے۔

ہمارے بعض احباب جدید الوضع ہندوؤں اور مسلمانوں کی ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر انہیں ایک قوم کہہ دیتے ہیں۔۔۔ لیکن سوال ان کا نہیں کروڑوں عوام کا ہے۔ ان کے مابین صرف وہ فرق نہیں جو صوبۂ سرحد کے پٹھان اور بمبئی کے مسلمان کے مابین ہے کیونکہ یہ فرق محض جغرافیائی ماحول کا ہے اور ان کے آپس میں گہرے روحانی اور تاریخی اور مشترک اسلامی نقوش معاشرت کے محکم روابط ہیں۔ ہندو اور مسلم کا فرق گہرا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس فرق نے ہزار سال کی یکجائی کے باوجود ذوق وذہن اور نقطۂ نظر میں جدا رکھا۔ اور وہ آج بھی جدا ہیں۔

آج بعض دوست پاکستان میں قبل اسلام قدیم تہذیبی علامتوں کے زور سے' دراوڑی اور ہند آریائی تہذیبوں کو مقدس بنا کر' دو قومی نظریۂ پاکستان کو منہدم کرنا چاہتے ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ مسلمان رہ کر کوئی اس منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

اگر مسلمانان پاکستان ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیبوں کو مقدس مان لیتے ہیں تو پھر بھارت کے مسلمانوں کیلئے مہابھارت کی تہذیب کیوں مقدس نہ ہوگی۔ اور خود پاکستان کے پنجاب میں رگ وید کو کیوں کر مقدس کتاب کا درجہ نہ دیا جائے گا۔

اور اگر مقصد یہی کچھ ہے کہ مسلمان ان تہذیبوں کے نام لیوا بن جائیں تو ہندوؤں کو اجازت دے دیجئے کہ تاریخ اسلام کے باب کو حذف کر دیں کیونکہ مسلمانوں نے خود اپنے تاریخی کردار پر خط نسخ کھینچ دیا ہے۔ جس دن ہم رگ وید کو اپنی مقدس کتاب مان لیں گے اسی دن سے قرآن کی ناسخانہ عظمت کو ہم مسترد کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ ہماری مقدس کتاب تو صرف قرآن مجید ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مطالبۂ پاکستان کی ظاہری اور وقتی وجہ کچھ بھی ہو اس کی اصولی اور مستقل اور گہری وجہ یہی معاشرت کا ناقابل حل اختلاف تھا جس کے زیر اثر سب دوسرے مسئلے مثلاً معاشی اور سیاسی اختلافات پیدا ہوئے۔ ان کے ہوتے ہوئے سیاسی مسئلہ حل بھی ہو جاتا تو بھی معاشرتی و معاشی مسئلہ برقرار رہتا۔ اور بالآخر یہ معاشی و معاشرتی مسئلہ ایک شدید تر تحریک پاکستان کو جنم دیتا۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے ظاہر میں سیاسی مسئلہ تھا مگر اس کے پیچھے زبردست معاشی عوامل چھپے چھپے اپنا کام کر رہے تھے جن کی بنا ایک ایسا معاشرتی احساس

Marfat.com

علیحدگی تھا جو جدا مذہب کے عقائد و تصورات سے ابھرا تھا___‘

یہ معاشرتی احساس علیحدگی ’امیر‘ غریب اور سرمایہ دار اور سرمایہ کے اصول پر نہ تھا بلکہ مذہبی طبقہ بندی پر تھا۔ ورنہ معاملہ یوں چلتا کہ سب ہندو اور مسلمان غریب ایک طرف ہوتے اور سب ہندو اور مسلمان امرا اور سرمایہ دار دوسری طرف۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہندو غریب اور امیر دونوں طبقے مسلمانوں کے بلاامتیاز غربت و امارت مخالف تھے اور اس مخالفت کا باعث بجز مذہبی اور معاشرتی اختلاف کے کچھ نہ تھا۔ غرض معاشرتی (یا وسیع تر ثقافتی) محرکات کا قیام پاکستان میں مؤثرترین حصہ تھا۔

Marfat.com

نواں باب

پاکستانی دَور

قیام پاکستان کے بعد جن مظاہر کی نمایاں ترقی واشاعت ہوئی وہ یہ ہیں:-

(1) مجالس میں اختلاط مردوزن اور پردہ داری کے پرانے طریقوں کا تدریجی زوال؛ (2) خواتین کی بیرونِ در سرگرمیوں میں اضافہ؛ (3) تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا رواج عام۔ اور طلبہ و طالبات کے بے محابا میل جول میں اضافہ؛ (4) لباسوں میں وضع داری اور حیاداری کے طریقوں کا زوال؛ (5) تفریحات میں مغربی انداز نظر کا فروغ؛ (6) عریانی کے مغربی میلان کی روزافزوں ترقی؛ (7) شادی بیاہ کی رسموں میں مغربی رواجوں کی روزافزوں ترویج؛ (8) سالگرہ کی رسموں میں اضافہ اور کیک کاٹنے کا دستور؛ (9) مغربی طرز کی تفریح گاہوں میں اضافہ؛ (10) بے مقصد فلموں کا رواج جن میں کلچر کے نام سے بے جہت اور بے اسلوب زندگی کی ترغیب؛ (11) صنعتی ترقی کے زیراثر دیہاتیوں کا شہروں کی طرف سفر اور نقل مکانی اور شہری زندگی پر اس کے برے اثرات؛ (12) دولتمند بننے اور مغربی (امریکی) طرز کے اعلیٰ معیار زندگی کیلئے مجنونانہ تگ ودو؛ (13) اب آخر میں نوجوان طبقوں خصوصاً طلبہ میں نظم و ضبط کی شکست کا رجحان؛ (14) بے ترتیبی، بے اخلاقی، بے عنوانی سے محبت؛ (15) عمارتوں کے امریکی انداز۔ پست چھتیں اور بند کمرے اور (16) درختوں کے متعلق مخالفت اور بدذوقی کا رویہ۔

اس سارے ہنگامۂ تجدد میں، یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ شے جسے فن کہا جاتا ہے، وہ اسلوب حیات جسے شائستگی، خوش ذوقی کہا جاتا ہے، وہ نادرہ کاری، وہ شوق تسخیر کائنات، وہ ذوق علم و تحقیق، وہ تگ و تاز جو ہر ایجاد و اختراع کی محرک ہوتی ہے، وہ تعاون اور جذبہ رفاقت جو ایک شریفانہ کلچر کی جان سمجھا جاتا ہے، وہ شہری ہمدردیاں جن کے بغیر کوئی انسانی معاشرہ بامعنی اور پُرمسرت نہیں بن سکتا، وہ حُسن عمل اور حسن اطوار جو کلچر کا زیور ہے

Marfat.com

اس نئے ماحول میں کم سے کم مطلوب ہے' خود غرضی' تن پروری' ہوس پرستی' لذت دوستی' جاہ طلبی کا رواج غالب ہے' اولوالعزمی' بے غرضی' ایثار' لگن' فضیلتوں کی محبت' بلند مقاصد حیات کے لیے جاں فشانی اور جدوجہد تقریباً ختم ہے۔

اس نئے ماحول کی سب سے بڑی قدریں دو ہیں۔ اول لذت پرستی' دوئم ان لذات کی خاطر دولت اندوزی ـــــ اور اس میں تعلیم یافتہ افراد قوم پیش پیش ہیں' بے علم عوام ان کی تقلید کرتے ہیں۔

اس نئے ماحول میں فن کا تذکرہ تو بہت کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اب کلچر کو فنون لطیفہ کا مترادف لفظ سمجھا جاتا ہے لیکن فن کے معیار سے متعلق جس نقاد فن سے تذکرہ ہوتا ہے وہ مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔ اسباب اس کے دو بتائے جاتے ہیں ایک سبب تو مرض تقلید ہے جس کے باعث ایجاد اختراع معانی کی تڑپ ختم ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ اپنے کلچر کی انفرادیت کا تصور مفقود ہے' ماضی کی روایت سے بے خبری بھی ہے اور اس کے بارے میں میلانِ تحقیر بھی۔ مگر مغرب کی جدید روایت میں اہل مغرب کے ساتھ مقابلہ کوئی نہیں کر سکا کہ اس کے لیے سخت محنت اور جاں فشانی کی ضرورت ہے اور وہ یہاں نہیں' اور بات یہ بھی ہے کہ موجد اور نقال کا فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ فن خود ایک تجارتی مشغلہ بن گیا ہے۔ اس کے ذریعے دولت بھی کمائی جا سکتی ہے' لذات کا حصول بھی ممکن ہے اور جاہ و منصب بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ یکسائی فقر' انہماک' خلوص' طہارت قلب و نظر جو حقیقی فن کے لوازم میں سے ہے ایسا محسوس ہوتا ہے اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔

اور اس پر تعجب ہے کہ احباب اس سارے زوال علم و فن کو پاکستانی کلچر کہنے پر مصر ہیں۔ مگر راقم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان ایک نیا ملک ہے اور نئے تجربوں میں مصروف ہے اسے انتخاب عناصر کے مراحل سے ابھی گزرنا ہے' ردّ و قبول کا مرحلہ ابھی آنے والا ہے۔ اگر پاکستان سچ مچ اپنی جداگانہ روحانی زندگی رکھتا ہے تو اس کی ذوقی و معاشرتی زندگی یقیناً اور معاشرتوں اور تہذیبوں سے مختلف ہو گی۔ اگر یہ محض تقلید مغرب ہے تو ہم اسے فرنگی کلچر کی توسیع قرار دیں گے پاکستانی کلچر نہ کہیں گے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کا غلبہ جب حقیقت ہے تو مغربی کلچر کیوں حقیقت نہیں؟

بیشک! مغرب کا غلبہ بھی حقیقت ہے اور مغربی کلچر بھی حقیقت ہے' تو اس صورت میں کسی پاکستانی کلچر کی گفتگو بے محل ہے' صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمارا کوئی منفرد

Marfat.com

کلچر نہیں اور ہم نے مغربیوں کا معاشرتی مذہب اختیار کر لیا ہے۔

لیکن یہاں فی الحال وہ نسلیں ابھی زندہ ہیں جنہوں نے اقبال اور قائداعظم کی زبانی تحریک پاکستان میں یہ سنا تھا کہ ہمارا ایک مخصوص کلچر اور ایک مخصوص طرز معاشرت ہے 'جو ہندوؤں سے جدا ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے فرنگیوں سے بھی جدا ہو گا۔) اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں بھی کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کا کلچر منفرد ہے۔ لیکن ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہے؟ اگر اس سلسلے میں اسلامی عناصر پر زور دیتے ہیں تو "ملائیت" کا خوف پریشان کرتا ہے۔ اور اگر اس عنصر کو خارج کرتے ہیں تو پھر موہنجوڈرو سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ مگر موہنجوڈرور کلچر کو تو ہندو بھی مقدس مانتے ہیں مگر قائداعظم کے ارشاد کے مطابق 'ہم دراوڑوں اور ہندوؤں سے مختلف کلچر کے مالک ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ اس منطق سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسے ہمارے تجدد پسند ماننے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا خلط مبحث ہے۔ ہندوستان میں فرنگیوں کے آنے کے بعد (اور اب پاکستانی دور میں بھی) قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کلچر کی اپنی گزشتہ روایت کی روشنی میں اس نئے درآمدی فرنگی کلچر کے ساتھ (خصوصاً اس کے غلبے اور فاتحانہ یلغار کے پیش نظر) نباہ کس طرح کرنا چاہیے۔ سول یہ بھی ہے کہ کلچر کی مختلف شکلوں کے اس تصادم سے کیا نتیجے نکلتے ہیں اور اس تصادم میں کونسا کلچر زندہ رہ سکتا ہے۔

پاکستان کی دقت یہ ہے کہ اسے ایک نظریاتی مملکت کہا جاتا ہے اور یہ نظریہ اسلامی عقائد پر مبنی ہے اس لیے قدرتی طور پر مغرب کے معاشرتی رویوں کے بارے میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام کے معاشرتی عقائد کے ساتھ ان کا نباہ کس طرح ہو گا؟

یہاں پہنچ کر کئی موقف سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ دوسرا یہ کہ مغربی کلچر ہی اسلامی کلچر ہے اور موجودہ دینی قیادت جن مغربی مظاہر کو غیر اسلامی کہتی ہے یہ ان کی کوتاہ نظری اور ان کا تشدد ہے۔

ایک موقف یہ ہے کہ کلچر آزاد عمل ہے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ یوں دیکھیے تو نظری طور پر پاکستان میں کلچر کے محاذ پر انتشار خیال پایا جاتا ہے۔

عملی طور سے مختلف دھارے کہیں متصادم ہو کر اور کہیں باہمی مفاہمت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دھارا مغربی مظاہر کا ہے جو آہستہ آہستہ اوپر کے اور درمیانے طبقے پر تقریباً غالب آچکا ہے دوسرا دھارا دیہات میں بسنے والے لوگوں کی طرز زندگی کا ہے جو قدیم انداز میں بہہ رہا ہے۔ اگرچہ مغربی طرز بھی آہستہ آہستہ دخیل ہوتی جارہی ہے۔ تیسرا دھارا

Marfat.com

شہروں میں بسنے والے نچلے درجے کو متوسط آبادی کی زندگی میں ہے جہاں مغربی اور مشرقی (اسلامی + مقامی) مظاہر میں تصادم ہے۔

اس لحاظ سے پاکستانی کلچر کا کوئی انفرادی نقش ابھی قائم نہیں ہوا۔ بظاہر اس کا رخ مغرب کی طرف ہے اور شاید عنقریب یہ ملک مغربی معاشرت کا گہوارہ بننے والا ہے کیونکہ یہ ملک کچھ پرانی غلامی کی ریتوں کا بالعموم شیدا ہے اور جدید تر دور میں نقالی کی منطق کا اسیر ہے چنانچہ مغربی ذائقے اور رویے اہل تعلیم اور اہل ثروت میں مقبول ہیں۔ اکثر فنون لطیفہ میں (خصوصاً مصوری میں) مغربی طریقہ ہائے فن کی نقل جاری ہے۔ موسیقی کا میدان اب تک اس نقل سے بچا ہوا تھا۔ کیونکہ ہندی اسلامی موسیقی کا خاص نقش و آہنگ رکھتی ہے لیکن اب اس میں مغربی آہنگ داخل ہو رہا ہے۔ اور رقص کے انداز تو اپنے نقشوں سے ہٹ کر تقریباً مغرب کے دائرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

غرض اس میدان میں بھی افکار قاہرہ موجود نہیں البتہ مقہوری (محکومی) کے افکار موجود ہیں جو بہر حال مغربی ہیں انہیں مخصوص پاکستانی کہنا تکلف سے خالی نہیں۔

ایک رجحانِ خاص یہ ہے کہ ملکی کلچر کو جو کچھ بھی ہے علاقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، تاکہ پاکستان کا کوئی سالم کلچر نظر نہ آئے۔ یہ کلچر کی سیاسی تعبیر ہے جو قومیتوں کے علاقائی تصور کو ابھارتی ہے۔ اور کلچر کے حوالے سے علاقوں کو الگ الگ کر کے دکھاتی ہے۔

یہ نہ دیکھنے کی بات ہے ورنہ پاکستان نے مختلف علاقوں کی معاشرت اور کلچر میں اب بھی مشترک نقوش زیادہ ہیں مختلف نقوش کم ہیں۔ لباسوں میں 'کھانوں میں' تفریحوں میں 'کھیلوں میں' تقریبات میں یکسانی کے بہت سے پہلو ہیں اور انصاف سے دیکھنے والے کو صاف نظر آتا ہے کہ ان علاقوں میں اصولی طور سے (عوام کی حد تک) مشترک طرز معاشرت کے بہت سے اوصاف اب تک موجود ہیں اور یہ دوسرے سیاسی تاریخی وجوہ کے علاوہ 'اسلامی اثرات کی وجہ سے بھی تھے۔

لیکن اب کوشش یہ ہو رہی ہے کہ ان تاریخی اسلامی وجوہ اشتراک سے انکار کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ علاقے الگ الگ ہیں اور اسلامی تاریخی نقش نہ تھا نہ ہے۔

اس وقت پاکستانی کلچر کی بس یہی کیفیت ہے۔

دسواں باب

پاکستانی کلچر "جدید ترین رجحانات"

پاکستان کی موجودہ زندگی سے پرانے نقوش مٹ رہے ہیں یا مٹائے جا رہے ہیں۔ مٹنے اور مٹانے کا یہ عمل، جدید تر اور جدید ترین تعلیم یافتہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے دعوے بدستور یہ ہیں کہ ہم دنیا بھر کی اقوام سے (خصوصاً ہندوؤں) سے جدا قوم ہیں۔ اور یہ دلیل صرف جغرافیے کی حد بندی پر قائم ہے۔ اس کے سوا، باقی ہر شے میں، یورپین اطوار کے توسط سے افرادیت کے نقوش غائب کیے جا رہے ہیں۔ اور ایک خاص نفسیات اور جغرافیے کی ایک لکیر کے سوا باہر کے کسی مسافر کے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستانی باثروت اور تعلیم یافتہ لوگوں کا معاشرت میں مخصوص اور منفرد نقش کیا ہے۔

افسوس ہے کہ اس مسئلے پر کوئی غور نہیں کرتا کسی خاص منصوبے کے تحت، ایک نفسیاتی مرحلہ بندی سے، انفرادیت کی دیواریں گرائی جا رہی ہیں —— اور ان کی جگہ نئے نشانات لگائے جا رہے ہیں اس ثقافتی ادغام کی طرف پہلا قدم موجودہ یورپین طرز احساس اور وضع زندگی ہے۔ اس کے سائے میں دوسرے نشانات بھی بتدریج لگ رہے ہیں۔

نئی پود کے ثقافتی رجحانات

حضرات مجھے سب سے پہلے یہ اعتراض کرنا ہے کہ میں آج کی بحث کے عنوان کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ عنوان ہے "نئی پود کے ثقافتی رجحانات" مگر اس سرخی میں مجھے ایک طرف تعلّی اور دوسری طرف طنز کا شائبہ نظر آیا ہے —— طنز کا شائبہ اس لیے کہ ثقافتی رجحانات کے سلسلے میں صرف "نئی پود" کا ذکر اس طعنے کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے نونہالوں

نے ثقافت کی کوئی نئی قسم ایسی اختراع یا دریافت کی ہے جو ان سے پہلے کی نسل یعنی ہم لوگوں کی ثقافت سے جدا تعلّی کارناگ اس لیے ہے کہ پرانی نسل والے گویا ان رجحانات سے بالکل پاک ہیں جو نئی نسل سے منسوب ہیں۔

مجھے اس عنوان کو پڑھ کر یا اس پر غور کر کے یہ گمان بھی گزرا ہے کہ یہ نئی پود شاید کوئی ایسی مخلوق ہے جو روس اور امریکہ کے فلک شگاف یا فلک نشین "سپٹنکوں" کے ہمراہ فلک الافلاک سے نازل ہوئی ہے اور وہ کوئی ایسی اجنبی اور عجیب الخلقت چیز ہے کہ ہمیں اس کے پہچاننے میں دیر لگ رہی ہے۔ غرض عنوان عجیب ہے 'نہایت عجیب اور طرح طرح کی بدگمانیوں سے معمور اور رنگارنگ خود فریبیوں سے لبریز۔۔۔ جس کی تفصیل و تشریح اگر معرض تعمیر میں آجائے تو پھر ہمارا آپ کا سب کا بھرم کھل ہی تو جائے۔۔۔ مگر اس نشست میں 'اپنا یا کسی کا بھرم کھولنا میرا مقصد نہیں' اس لیے چند سیدھی سیدھی باتیں براہِ راست مضمون ہی کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

حضرات! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نئی پود کے ثقافتی رجحانات وہی ہیں جو ان کی بزرگوار نسل نے ان میں پیدا کیے ہیں نئی پود ظاہر ہے کہ پرانی پود کی جانشین اور تربیت یافتہ ہے۔ لہٰذا نئی پود کی تربیت جن لوگوں نے کی ہے ان کی اور نئی نسلوں کی ثقافت میں کوئی قدرتی رابطہ تو ضرور ہونا چاہیے کیونکہ کوئی قدرتی رابطہ تو ضرور ہونا چاہیے کیونکہ کوئی ثقافت دفعتاً صورت پذیر نہیں ہو جاتی۔ وہ تو ایک طویل سلسلے کی ایک آخری شکل ہوتی ہے۔ لہٰذا نئی پود کے رجحانات کی نقاب کشائی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ ان رجحانات کے سرچشمے کہاں سے پھوٹے ہیں۔

میں ذاتی طور پر نئی پود کی کسی مخصوص و منفرد ثقافت سے باخبر نہیں ہوں مگر میں نے اکثر یہ شکایت سنی ہے کہ نوجوانوں میں خود سری' بدوضعی' بے لحاظی اور اخلاقی بے رنگی عام ہو رہی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اب ان کے رویے' مزاجی یا بے سماجی رویوں کا رنگ اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ان کی تفریحات' ان کی وضع اور ان کا عام برتاؤ عجیب و غریب ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ ایک ایسی انداز زندگی اختیار کرتے جاتے ہیں جو لاابالی اور بے وضع اور بے فکرے لوگوں کا ہونا چاہیے۔

ممکن ہے نئی نسل پر یہ الزامات درست ہوں مگر میں پھر کہوں گا کہ یہ سارے رجحانات نوجوانوں میں اچانک تو پیدا نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کے پیدا ہونے میں کسی طویل سلسلہ و اسباب نے حصہ لیا ہوگا اور ان کے نمایاں ہوتے ہوتے تعلیم و تربیت کی بہت سی

منزلیں طے ہوئی ہوں گی۔ لہٰذا میں نئی پود کی کج روی اور بے راہ روی میں پچھلی نسلوں کو برابر کی نہ سہی مگر کچھ کچھ شریک مانتا ہوں ع

وہی شریر نہیں کچھ شریر ہم بھی ہیں

نئی پود پر فکری بغاوت اور روایت شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے مگر اس کی ابتدا تو ایک سو سال پہلے کے تاریخی و سماجی واقعات میں ہوتی نظر آتی ہے۔ جب خالص عقلی اور مادی نظریہ ہائے حیات کو اس ملک میں پھیلایا گیا تھا۔ جب قدیم کو ہیچ اور ہر جدید کو لذیذ بر حق کہا گیا تھا۔ جب مشرق کی ہر بات کو مغرب کی ہر ادا کے سامنے ذلیل کیا گیا تھا—— وضع کی تبدیلی کا حادثہ بھی قدیم ہے' اور سماجی قیود اور پابندیوں کو توڑنے کی حرکت بھی کوئی نئی نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ گزشتہ دور غلامی میں' بہت سی چیزیں پچھلی نسلوں نے خوشامد سے اختیار کر لی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پھیلتا گیا اور ہر نئی نسل پرانی نسل کے مقابلے میں زیادہ کھلی بغاوتوں کی طرف بڑھتی گئی مگر اس وقت کسی نے ان بغاوتوں کا تجزیہ نہ کیا' پرانا نظام تعلیم ہمارے حق میں زہر قاتل تھا مگر اس کو آبِ حیوان کہا جاتا رہا—— اس سے علم اور روح کے رشتے کٹ گئے۔ مگر 1960ء سے پہلے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہ کی۔ شبلی' اکبر اور اقبال بلاشبہ چیختے رہے مگر حالی کی مغربی پیروی کا زہر کچھ ایسا پھیل گیا تھا کہ لوگ انتہاؤں کی طرف بڑھتے گئے تا آنکہ وہ مقام آ گیا جو ایک قدرتی ارتقائی منزل کے طور پر ایک ایسی سرحد پر واقع ہے جسے دیکھ دیکھ کر پچھلی نسل کے لوگ اب دہشت زدہ سے ہو رہے ہیں حالانکہ یہی لوگ دراصل اس صورت حال کے ذمے دار ہیں کیونکہ نئی پود کا کردار انہی کی ابتدائی کج روی کی زیادہ بگڑی ہوئی شکل ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان کی گزشتہ ایک صدی ان کے فکری اور روحانی افلاس کی صدی تھی جس میں انہوں نے کسی کمزوری کی بنا پر چبائے بغیر نگلنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ وہ فکری سوءِ ہضم ہے جس کی شکایت اب قومی معالجوں کو پریشان کر رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سب مصیبت مغربی فکر و ادب کے مطالعہ سے پیدا ہوئی مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مغربی فکر سے پیدا نہیں ہوئی مغربی فکر و ادب کو چبائے بغیر نگلنے کی عادت سے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں مغرب کے حکما و ادبا کی پوری بات کسی نے نہیں سنی۔ نیم بہروں کی طرح بس آدھی بات ہی سنی جاتی رہی۔ فرانسیسی انجینئر ادیب (Sorel) کو پڑھنے والوں نے یہ تو پڑھ لیا کہ پرانے ہر نظام کو درہم برہم کر دینا ہی معاشرہ کا

سب سے بڑا فرض ہے۔ مگر یہ نہ جانا کہ کسی نظام کو درہم برہم کرنے والوں کے پہلو بہ پہلو مغرب میں انسان دوستوں کے ٹھٹ ایسے بھی ہیں جو زندگی کے نظم میں انسان کی بقا جانتے ہیں۔ یہاں لوگوں نے روسو کے اعترافات اور اس کی ذہنی یا عملی اوباشی کا قصہ تو سن لیا مگر روسو کے معاہدۂ عمرانی اس کی تعلیمی کتاب ''امیل'' پر نظر نہ ڈالی۔۔۔ غرض کچی پکی ہر قسم کی بات سن کر صرف برائی اور مادر پدر آزادی پر نظر رکھی اس کے تعمیری پہلو کو نظر انداز کر جاتے رہے۔ مادیت اور نفع پرستی اور روایت شکنی کے جو خوفناک فلسفے اس ملک میں پرورش پاتے رہے ہیں اور وہ نظام تعلیم کا جزو بن کر ہر نوجوان کے قلب و جگر میں پیوست ہوتے رہے۔ تربیت کے تمام راستے بند ہو گئے۔ گھر' مسجد اور مکتب سب کے پٹ بند۔۔۔ سکول' کالج' سینما' ٹھنڈی سڑک' پھر کلب' پھر گرل گائیڈ۔۔۔ یہ ہماری تربیت کے مقام بنتے رہے مگر بے احتساب' بے قید' بزرگوں کی ناک تلے' ان کے بھوں میں مسجد زیر سایہ خرابات ہوتی چلی گئی مگر سب اس ناؤنوش کو غفلت کی آنکھ سے دیکھتے رہے غرض ان رجحانات کا نہ جائزہ لیا گیا نہ ان کی تشخیص ہوئی اور ان کی آج بھی صحیح معنوں میں تشخیص نہیں ہوئی اور یہ سب کچھ نئی پود نے نہیں پرانی پود ہی نے کیا۔۔۔ اور اس پر تعجب ہے کہ اپنے ہی لگائے ہوئے زقوم و حنظل کا زہرناک کڑوا مزا جب خود چکھا ہے اور اپنے لخت جگر کو گھر سے روپیہ چراتے' ڈاکے ڈالتے دیکھا ہے اور امریکی فلم کی مہربانی سے تو نئی پود کی ملامت کا باب کھول دیا گیا ہے۔

حضرات! میری اس تلخ نوائی کو معاف کر دیجئے اور میری اس گفتگو سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی ٹیڈی بوائے یا کسی ٹیڈی گرل کی حمایت کر رہا ہوں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ نئی پود کی ثقافت یا برائیوں کا پہلا علاج یہ ہے کہ پچھلی نسل کے لوگ پہلے اپنے معالج بنیں مگر یہاں تو یہ ہے۔

ع مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

لہٰذا ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے انداز حیات میں توازن استقامت اور حسن و خوبی پیدا کریں۔ اور اپنے بدلے ہوئے کردار کی مدد سے نئی پود کو محبت سے راہ راست پر لائیں' اور اپنی اس کج روی کا اعتراف کریں جس کی شاخ تلخ سے یہ کڑوا پھل پیدا ہوا ہے۔

ہماری آج کی بحث میں ثقافتی رجحانات کا جو ذکر ہے اس کا بھی صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ثقافت سے کیا مراد ہے؟ ممکن ہے ثقافت سے مراد تنگ اور چست لباس ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ ثقافت سے ایک سائیکل پر دو آدمیوں کا بیٹھنا مقصود ہو۔ عین ممکن

Marfat.com

اور رقص دیکھنا ہو۔۔۔ یا فنکاروں کی کٹیا میں مجسمہ سازی ہو۔۔۔ غرض ثقافت کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں بھی نئی اور پرانی پود کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔۔۔ رہی جو نئی پود کا خاص تذکرہ کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ نئے لوگوں میں کوئی خاص لہجہ ایسا پیدا ہو گا جو پچھلی نسل کو نیا نیا معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں نئی چیز فقط اتنی ہی ہے کہ نئی پود نے وہی باتیں برملا اور بے روی وریا کہنا اور کرنا شروع کر دی ہیں جن پر پچھلی نسل عمل تو کرتی تھی مگر زبان سے ان کے خلاف کہتی رہتی تھی۔۔۔ مثلاً میں نے امریکی فلم کو ہمیشہ ناپسند کیا مگر ہفتے میں دو دو تین تین بار اس کی زیارت کی۔ میں انگریزی لباس میں سفید کالر اور رنگین ٹائی کو بہت پسند کرتا ہوں مگر مجھے پتلون کی وضع سے ہمیشہ نفرت رہی۔ پھر بھی گزشتہ بیس برس سے پتلون کی برہنگی کی خلاف نفرت بھی کیے جا رہا ہوں اور اس کو جسم پر لٹکائے بھی جا رہا ہوں۔ غرض قصہ وہی ہوا جس کو اکبر نے یوں ادا کیا ہے۔

شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی
بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی

مجھے اپنی زندگی میں تین آدمیوں کی روش کو دیکھ کر اکثر ہنسی آتی ہے۔۔۔ ایک میتھیو آرنلڈ کی روش پر جس نے ہمارے یہاں کے ناصحوں کی طرح وکٹورین کلچر پر اعتراض تو کیے مگر خود وکٹورین کلچر کی تشکیل میں پورا حصہ لیا۔ دوسرے بزرگ نیاز فتح پوری ہیں جن کی رومانی تحریروں نے اس ملک میں رومانیت کے راستے سے جنسی بے راہ روی کے لیے پہلی مرتبہ راستہ صاف کیا مگر اب جنسی بے راہ روی کے بارے میں ان کے خیالات جب سنے جاتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ اور تیسرا شخص جس کے قول و فعل کے تضاد کو دیکھ کر بے محابا ہنسی آجاتی ہے وہ یہی ننگ وجود ہے جو آپ کے سامنے کھڑا ہے۔

زمن حذر نہ کنی گو لباس دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

میں نے خود اپنا ذکر اس لیے کیا ہے کہ میں کسی اور کو ملامت کرنے سے پہلے خود اپنا محاسبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور قبل اس کے کہ میرے لوگ میرے قول و فعل کے تضاد کا پرچہ چیک کریں میں خود اپنے نفس کے خلاف گواہی دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور شاید یہی طریقہ ہم میں سے ہر شخص کے لیے مناسب ہو گا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ ثقافتی رجحانات کی بحث میں کسی ایک طبقے کو موضوع سخن بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ رجحانات دراصل مجموعی قومی خصائص سے پیدا ہوئے

Marfat.com

ہیں لہٰذا ان کے برے پہلوؤں کا مداوا یا تدبیر مجموعی قومی پیمانے پر ہونا چاہیے۔

میں یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ثقافت صرف خارجی مظاہر کا نام ہے' نہ یہ عادات کا صرف خارجی روپ ہے۔ ہر ثقافت کی ایک داخلی روح ہوتی ہے۔ لہٰذا قومی ثقافت کے لہجے یا اسلوب میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک افکار عقائد کی داخلی سطح میں تبدیلی میں کوئی انقلاب رونما نہ ہو۔ ثقافت دراصل افکار و عقائد ہی کا تابع ہے اس لیے اگر رنگ ثقافت کو بدلنا مقصود ہے تو روح افکار میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میرے اپنے خیال میں ہمارے ملک میں تین اہم امور کی طرف توجہ ہونا چاہیے۔ ان میں پہلی چیز ضمیر داری کی تحریک ہے۔ ضمیر داری سے میری مراد نیکی و بدی کے درمیان اس فرق کا شعور ہے جس کی بنا انسانی شرافتوں کی حفاظت کے عقیدے پر قائم ہو اور جس کا مقصود حق و انصاف کے تقاضوں کا بے لاگ تحفظ ہو۔ یہ سچائی اور بے خوفی کا مشن ہے مگر اس کا تعلق' اس دل آزاری سے نہیں جس کو لوگ غلطی سے بعض اوقات حق گوئی اور ضمیر داری کہہ لیا کرتے ہیں۔ ضمیر داری' محبت کا ایک فریضہ ہے۔

دوسری چیز جس کی اس ملک کو بے حد ضرورت ہے وہ اس خیال کی تربیت ہے کہ وفاداری کا رشتہ' انفرادی اور اجتماعی آسائش اور ترقی کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ میری مراد وفاداری سے ہر قسم کی وفاداری ہے جس میں اپنے ملک سے اپنے دین سے' اپنے شہر سے' اپنے عیال سے' اپنے احباب سے اور اپنے آپ سے وفاداری شامل ہے' ہمارے ملک میں جب سے بغاوت کا غلط تخیل پیدا ہوا ہے اس وقت سے غداری' بے رحمی' بے دردی' روحانی بے رنگی' دوست کشی' برادر کشی' ملک فروشی جیسے امراض زیادہ ہو رہے ہیں۔ بغاوت کا جذبہ 'اعتماد کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی سے وہ تمام اجتماعی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو کبھی ملک کے لیے پریشان کن ثابت ہوتی ہیں اور کبھی فرد اور کنبے کی سطح پر اذیت کا باعث ہوتی ہیں — لہٰذا مسلک وفاداری کو استوار کرنا' ہمارا ایک اہم فرض ہے۔

اب تیسری چیز جس کیلئے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے وہ ہے سلیقہ' شہرت' سلیقہ' شہرت میں تمام وہ اجتماعی آداب اور عادات شامل ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو حسین بنا سکتی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس سلیقے کی بھی اس ملک میں بہت کمی ہوتی جارہی ہے اور اب اس کی جگہ کھردرا پن پیدا ہوتا جارہا ہے اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے مشاہدے کے مطابق یہ کھردرا پن سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں میں پایا جاتا ہے — مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ جاہل شہریوں سے کچھ زیادہ ہی جرأت کے ساتھ

Marfat.com

شارع عام پر گائیں بھینسیں باندھتے ہیں — خوبصورت سبزے کے پلاٹوں کے اندر سے موٹریں دوڑاتے پھرتے ہیں اور اگر ان کو کوئی روکے تو اپنی بدوضع اور بدبودار انگریزی میں (Mind your own business.) سے ملکی فضا کو مکدر بنا دیتے ہیں۔

حضرات! یہ سب امور قابل غور ہیں۔ ان کی تکمیل سے ملکی ثقافت کے غلط رجحانات کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس میں ایک ایسا حسن اور دلکشی پیدا ہو سکتی ہے جس سے دلکشائی اور انبساط کے صد رنگ باغ ہم پر کھل سکتے ہیں مگر ایک سوال اور بڑا سوال یہ ہے کہ یہ سب ہو کیسے؟...... یہ تو بکاؤلی کے باغ کے اس پھول کی مانند' کہیں دور اتنا دور معلوم ہوتا ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے کسی سیف الملوک ہی کی ضرورت ہو گی۔ بہر حال یہ ایک بڑی مہم ہے جس کی تدبیر مل کر سوچنا ہو گی۔ مگر خدارا' اس مہم کو نئی پود تک محدود نہ رکھیے یا صرف مولویوں کو اصلاح کے قابل خیال نہ کیجیے۔ اصلاح کا یہ پروگرام ساری قوم کے لیے ہے اور اس کا اطلاق ساری قوم پر ہونا چاہیے۔

آخر میں مجھے عرض کرنا ہے کہ نئی پود کے مسائل کو محبت اور دل سوزی کے انداز میں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تنگ پتلونوں یا پھیلی ہوئی شلواروں کی بھی اصلاح کیجیے مگر پہلے ان کے دلوں کو بدل ڈالیے اور اس بے اعتمادی کو دور کیجیے جو انہیں آپ سے' مجھ سے' قوم کے بزرگوں سے' پچھلی نسلوں سے' اور ان کی نمود و نمائش سے ہے۔ آج اگر ملکی ثقافت کی آخری دیوار بھی ان کے ہاتھ سے گر رہی ہے تو یہ بھی تو سوچیے کہ اسی ثقافت کی باقی دیواریں ان سے پہلے ہم ہی نے تو گرائی تھیں۔ بس اس غلطی کا اعتراف کر کے قومی ثقافت (اور ثقافت کیا؟ یہ تو بے معنی لفظ ہے) انسانیت اور اعلیٰ شہریت کے چمن آراستہ کرنے میں نوجوانوں کی امداد کیجیے — میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نوجوانوں میں صفائی اور ضمیر داری کا جوہر زیادہ موجود ہے۔ اس جوہر سے فائدہ اٹھائیے اور آگے بڑھ کر ان میں اس وفاداری اور اس اعلیٰ شہرت کے اوصاف بھی پیدا کر دیجیے جن کا اصل سرچشمہ ضمیر داری ہے! یہ کام اگر کسی کو کرنا ہو محبت اور صرف محبت سے انجام پا سکتا ہے۔

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت ہی سب کچھ زمانے میں ہے

Marfat.com

گیارہواں باب

پاکستانی کلچر پر جدید ترین مغربی میلانات کا اثر

یہ سطور 1974ء میں لکھی جارہی ہیں۔ اس سال پاکستانی کلچر 'اس نقطۂ عروج کے بہت قریب پہنچ گیا ہے جو یورپ اور امریکہ کے اکثر معاشروں کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔

کلچر کے یہ رخ عبارت ہیں چند مظاہر حیات سے؛ اول نوجوانوں خصوصاً طالب علموں میں کجروی' قاعدے اور ضابطے کے خلاف ان کی بغاوت' آزادی بے ترتیبی اور بے ڈھنگا پن کا میلان' سنجیدگی اور مقصد کا فقدان' اور بڑی حد تک تشدد سے دلچسپی یہ نوجوانوں کے عمومی میلانات ہیں؛ دوم خواتین میں صنفی بنیادوں پر مردوں کے خلاف بیزاری کا احساس' اپنی صنف کے بارے میں غیر معتدل شعور۔ نئی آرزوؤں اور امنگوں کا ظہور جن میں آزادی بے قید کا عنصر غالب ہے' مغربی خواتین کی پیروی کا جنون شوق۔ سوم: خواہشات نفس کا ہر چیز پر فائق ہونا— ' اور ان کی تسکین کیلئے استحصال' بدنیتی' لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ۔ اخلاقی وروحانی اقدار کی پامالی' اور احتساب کے ہر رنگ سے آزادی کا اعلان۔

اہم رخ یہی ہیں۔ باقی کچھ باتیں ہیں وہ بھی دراصل انہیں کے زیر اثر اور تابع ہیں۔

نیویارک یونیورسٹی کے ایک استاد نفسیات (Daniel Yankeovich) نے جس نے یونیورسٹیوں کے طالبہ کے ذہن کا غائر مطالعہ کیا ہے لکھا ہے کہ موجودہ امریکہ میں طلبہ کی معاشرتی بغاوت' فطرت پرستی و نیچر لزم' کی طرف رجعت کے تصور پر زور دینے کا نتیجہ ہے (ملاحظہ ہو اس کی کتاب Changing Values on Campus یعنی امریکہ (اور یورپ) کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ مشینی اور صنعتی تہذیب نے انسان کے لیے جو ماحول پیدا کر دیا ہے وہ مصنوعی ہے۔ لہٰذا انسان کی داخلی اور خارجی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ اس سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ اب لوگ پھر فطرت کی طرف لوٹ جائیں اور قدیم سادہ ماحول میں پہنچ جائیں تاکہ شہروں کی آلودگیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ان کا اعلان ہے کہ

جو کچھ فطری (نیچرل) ہے وہی اچھا ہے۔

نیچر اور نیچرل کے بیس پچیس معنی ہیں۔ ان میں سے نوجوانوں (طلبہ) کے نزدیک اس کے مفہوم میں جو کچھ شامل ہے وہ یہ ہے:

1۔ ڈارون کے نظریۂ بقائے اصلح (Surivival of the fittest) ایک فرسودہ خیال ہے اس کے بجائے صحیح یہ ہے کہ انسان باہمی تعاون اور ارتفاق کا محتاج ہے۔ اور یہی تعاون وارتفاق نسل انسانی کو زندہ رکھ سکتا ہے۔

2۔ حسی تجربہ خیالی اور تصوری علم پر ترجیح رکھتا ہے۔

3۔ جسمانی طور سے نیچر کے قریب رہنا چاہیے۔ شہروں سے دور دیہات اور پہاڑوں میں۔

4۔ شہروں کے اجتماعی نظاموں کے بجائے قدیم زمانے کی طرح قبیلوں اور خاندانوں کی صورت میں رہنا چاہیے۔

5۔ ریاکاری اور نمائش کو ترک کر کے ہر بات صاف صاف کرنی چاہیے۔

6۔ فطرت کے جن مظاہر کو سائنس نے اجاگر کیا ہے ان کی حوصلہ شکنی کر کے فطرت کے سادہ پراسرار اور تخیلی رخوں پر زور دینا چاہیے۔

7۔ معاشرے میں مقابلے کے بجائے تعاون کے رجحان کو اہمیت دینی چاہیے۔

8۔ Being پر زور دینا چاہیے نہ کہ (Planning becoming) پر۔

معروضی طریق کار اور علمی غیر جانبداری کا رویہ ترک کر کے براہ راست شخصی اور داخلی تجربوں کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔

جہاں تک ممکن ہو ابتدائی فطری رویے اپنائے جائیں اور جامہ زیبی وضع ولباس کی تقطیع اور زیبائش و تکلف کے مصنوعی طریقوں کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔

ادبی وفنی پیرائے ترک کر کے فطری طرز کے اشارے اور علامتیں اپنائی جائیں۔

منصب اور اقتدار کے حصول کے موجودہ طریقے ترک کر کے ابتدائی قدیم انسانوں کی طرح اقتدار بذریعہ تسخیر قلوب جو از خود کسی کو معتبر بنا دیا کرتا تھا حاصل کیا جائے۔

فطرت کی تسخیر کی کوششیں ترک کر کے فطرت سے محبت ورفاقت کے اسلوب اختیار کیے جائیں۔

نظام و تنظیم اور ادارہ بندی منصوبہ بندی کو ترک کر کے فطری طریقہ ہائے

Marfat.com

تعاون کو اپنایا جائے۔ ضابطے اور قاعدے منسوخ کردیئے جائیں۔ جو فطری زندگی سے متصادم ہیں، مثلاً جنسی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے قواعد قابل تنسیخ ہیں۔

اپنی فطرت کے اندر غور کر کے معرفت نفس حاصل کی جائے۔

اجتماعی پسندی پر زور۔ فرد کے بجائے Community کے تصور کو ابھارا جائے۔

ٹیکنالوجی اور ترقی کے نام سے فضا اور ماحول میں جو آلودگی پیدا ہو چکی ہے اس کی مخالفت کر کے صاف ستھرا فطری ماحول برقرار رکھا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ امریکہ میں نوجوانوں کے ذہنی رجحانات تین ہیں:

(1) مغربی مشینی تہذیب کی تنہائی اور "فروکشی" کے برعکس اجتماع پسندی۔

Stress on community. (2)

(3) anti-intellectualism اور نیچر کی طرف رجعت۔

انہیں رجحانات کے زیر اثر، ان میں بے ڈھنگے اطوار، غیر موزوں حرکات، آرائش و زیبائش (یا مقطع صورتوں) کی مخالفت اور عقلی منطقی پیش قدمی کے بجائے جبلتی جذباتی روش، صفائی، سلیقہ اور ترتیب سے نفرت، ضبط نفس کی ہر صورت سے انحراف، روایات اور مرتب نظام ہائے فکر و عمل سے دوری جیسے میلانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ٹیڈی، ہپی، برہنہ مادر زاد، مجہول قسم کے گروہ ترقی پر ہیں جو تہذیب، عقل، روایت اور رکھ رکھاؤ (آداب وغیرہ) سے بالکل بغاوت کر گئے ہیں۔

مشرقی ممالک کے لوگ جب سے یورپ کے تسلط سے مرعوب اور خوف زدہ ہوئے ہیں، بالعموم تقلید و تحسین کا رویہ رکھتے ہیں اور امریکہ اور بلاد مغرب سے آئی ہوئی ہر شے کو برتر، اعلیٰ اور معقول خیال کرتے ہیں۔

اس مرعوبیت کی وجہ سے، پاکستان میں بھی (مغربی تعلیم سے آراستہ، بورژوا طبقات کے) نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مذکورۂ بالا میلانات سے (بطور فیشن) متاثر ہیں اور کھاتے پیتے اونچے گھرانوں کے یہ نونہال (کسی روحانی کرب کی بنا پر نہیں) محض مجلسی روایتوں کو توڑنے کے لیے اور اپنی دانشوری کا ثبوت مہیا کرنے کیلئے اطوار میں بے ڈھنگا پن، مکروہیت اور ناگوار (اور عموماً عجیب و غریب) حلیے بنانے کے عادی ہو چکے ہیں۔

یہ صورتحال امراکی فیشن ایبل آبادیوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی کثیر آبادی پر اس کا اثر بھی برائے نام ہے۔ اگرچہ روایت شکنی کے علمبردار اسے شب و روز (اپنے مخصوص علمی دلائل کے زور سے) عام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

پاکستان میں اس میلان کے عام نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان ابھی یورپی تہذیب کے "مقطع" انداز کو بھی جس میں سلیقہ' نوک پلک تک کی احتیاط اور صورت کی تکمیل کا خاص خیال رکھا جاتا تھا' اچھی طرح جذب نہیں کر پایا اور اس کی تحصیل میں لگا ہوا ہے۔ ہپی ازم ابھی اس کی نظر میں جچا نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مغرب اور امریکہ میں بھی یہ فیشن عام نہیں' یہ محض جزوی سا احتجاجی مظاہرہ ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جہاں امریکہ وغیرہ میں' یہ مظاہرہ ایک خاص سماجی صورتحال کار دعمل ہے پاکستان میں وہ صورتحال سرے سے موجود ہی نہیں۔ وہاں صنعتی زندگی نے فرد کو مشین کا پرزہ بنا کر' بے جان اور بے روح یا ہے لیکن مشرقی ممالک میں صنعتی دور صحیح معنوں میں طلوع ہی نہیں ہوا' لہٰذا یہاں یہ کسی روحانی کرب کا مسئلہ نہیں اور آبادی کے جس قلیل حصے نے اس فیشن کو اپنا لیا ہے وہ بھی محض ادائے رسم یا اظہار ندرت ہی ہے۔

با ایں ہمہ' یہ میلان نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ یہ فی الحال نہ سہی آگے چل کر حیو ت کی منزلوں تک لے جانے والا میلان ہے' یہ ان منزلوں کی سمت نمائی کر رہا ہے...... لہٰذا اس تحریک کا مسلسل عقلی و علمی تجزیہ ہوتے رہنا چاہیے۔

Marfat.com

بارہواں باب

اسلامی کلچر سے متعلق کتابوں کے بارے میں

قیام پاکستان کے بعد (اور اس سے پہلے بھی) اسلامی کلچر کے موضوع پر کچھ محققانہ علمی کتابیں شائع ہوئی ہیں، کچھ اچھی کتابیں ان کے باوجود پہلے بھی موجود تھیں۔ ان کے باوجود جو میں اس عنوان کو موضوع تحقیق بنا رہا ہوں تو اس کیلئے وزنی اور قطعی وجہ جواز چاہیے۔

قارئین کو یہ اطمینان دلانا از بس ضروری ہے کہ مذکورہ کتابوں کے ہوتے ہوئے میری موجودہ کاوش سے کونسا نیا پہلو اجاگر اور کونسا نیا زاویہ یا نیا گوشہ روشن ہوگا —— ورنہ محض تکرار حاصل تو امر بے حاصل ہی ہوگا۔

قارئین کی یہ توقع یا یہ تقاضا بالکل درست ہوگا لہٰذا میں بڑے اختصار کے ساتھ اس مقصد خاص کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو میرے مدِنظر ہے اور جس کے لیے کچھ کام کرنے کی واقعی گنجائش ہے۔

اس غرض کے لیے، میں اس موضوع سے متعلق لکھی ہوئی چند پرانی اور نئی کتابوں کا تجزیہ کرتا ہوں تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ مذکورہ کتابوں میں کیا کچھ بیان ہوا ہے اور کیا کچھ رہ گیا ہے اور یہ بھی کہ ہر کتاب کا نقطۂ نظر اور دائرۂ بحث کیا ہے؟ اس تجزیے کے بعد میں یہ بیان کرسکوں گا کہ میری موجودہ تحقیق کس خاص ضرورت کو پورا کررہی ہے۔

میں سب سے پہلے تازہ ترین دو کتابوں کا ذکر کرتا ہوں ان میں سے ایک اردو میں مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب اساسیات اسلام ہے اور دوسری انگریزی محمد مظہر الدین صدیقی کی کتاب Concept of Muslim Culture in Iqbal ہے جو انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر اسلام آباد نے شائع کی ہے۔

اساسیات اسلام اصولی کتاب ہے اور سچ پوچھیے تو اس کتاب کا تعلق اسلامی کلچر کے سرچشموں سے ہے۔ اسلامی کلچر (جو میرے نزدیک خارجی عمل اور مظاہرہ ہے) سے نہیں۔

Marfat.com

اس میں شبہ نہیں کہ خارجی عمل' عقائد وافکار سے منقطع نہیں ہو سکتا مگر محض سر چشموں (عقائد وافکار) کی بحث ناکافی ہے کیونکہ کلچر ہے ہی وہ جو خارج میں ظاہر ہو' اس خارج کے باطن میں جو عقیدے بھی ہوں انہیں کلچر نہیں کلچر کے سر چشمے ہی کہا جائے گا۔

شاید اسی وجہ سے کتاب کا نام اساسیات اسلام رکھا گیا ہے۔ ثقافت یا کلچر نہیں رکھا گیا۔

اس کتاب میں صرف چھٹا باب کلچر کے معین موضوع سے بحث کرتا ہے جس کا عنوان ''اسلام کا تصور ثقافت'' ہے باقی ابواب کا تعلق اساسیات اسلام سے ہے جن سے اسلامی ثقافت متاثر ہوئی۔ اسلام کی سیاسی قدریں' اقتصادیات میں اسلام کا موقف' اسلام کا نظریۂ اخلاق تعمیر فرد' نظریۂ توحید اور اس کی اساس۔ یہ سب موضوعات اسلامی ثقافت کے سر چشموں سے متعلق ہو سکتے ہیں مگر ان سب محرکات کے زیر اثر' کیا ثقافت ظہور میں آئی اور اس کی عملی شکل کیا تھی یہ مباحث اس کتاب سے قدرتاً اور بجا طور پر خارج ہیں۔

بلاشبہ میری کاوشوں میں بھی کلچر کے سر چشموں کا ذکر ہے مگر میں مسلمانوں کے خارجی اور عملی اسالیب حیات کی طرف زیادہ متوجہ ہوا ہوں۔

اسلام کا تصور ثقافت کیا ہے؟ ندوی صاحب نے اس موضوع پر محققانہ بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت میں ''فکر و عمل کی وہ تمام کوششیں داخل ہیں جو کسی نہ کسی تضاد کو رفع کرتی ہیں'' (ص 103) اور ''ثقافت نظریہ و عمل سے ترتیب پذیر ہے'' (ص 105) اور رفع تضاد و تہذیب انسانی کا واحد نصب العین ہے'' (ص 112) ''اسلام نے جسم و روح میں رونما تناقض کو ختم کر کے انسانی زندگی' انسانی فکر اور انسانی تہذیب پر بڑا احسان کیا ہے۔'' (ص 116)۔

ندوی صاحب کی رائے میں اسلامی ثقافت کی تشکیل کرنے والے سب سے اہم دو عقیدے ہیں؛

(1) ربوبیت کبریٰ اور (2) وحدت انسانیت۔ اسلامی ثقافت نے اپنے عمل میں ان دو عقیدوں کو خارج میں متشکل کرنے کے لیے بڑی سعی کی ہے۔ دنیا میں متضاد و مختلف اجتماعات انسانی کو جس قدر اسلام نے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے کسی اور مذہب یا نظام نے نہیں کی۔

اسی طرح ایمان بالآخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کی تہذیبی سمتوں کی تعیین کی ہے۔ اس تصور سے زندگی کے چلن میں تین واضح تبدیلیاں ابھرتی ہیں یا تین میلانات پیدا ہوتے ہیں۔

Marfat.com

(1) تقدیس حیات؛ (2) توازن واختصار (انتخاب) اور (3) پاکیزگی اور محاسبے کا احساس۔

ان تین میلانات میں سے ' ندوی صاحب نے جس چیز کو محاسبے کا احساس کہا ہے میں نے اپنی تحقیق میں اسے ضبط و تمکین اور تقویٰ کا نام دیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اسلامی کلچر کا سب سے اہم مابہ الامتیاز یہی ضبط و تمکین ہے۔ اس کے علاوہ انتخاب کا عمل بھی اسلامی ثقافت کے مخصوص عوامل میں سے ہے اور ایک لحاظ سے یہ بھی ضبط و تمکین کی ایک صورت ہے۔ اسلام کا مروجہ اصطلاح کے مطابق فنون لطیفہ کے متعلق کیا رویہ ہے؟ ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ "اسلام جس طرح اس کائنات کو معروضی Objective شے سمجھتا ہے اسی طرح اس کے نزدیک حسن و جمال کا وجود بھی معروضی ہے۔ حسن و جمال کا احساس فطری ہے مگر یہ محض موضوعی نہیں ــــ "اسلام جمالیاتی نقطۂ نظر کی اہمیتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ اس سے ابلاغ' تعمیر اور بلندی فکر و کردار کا کام لیا جائے۔" (ص 145)' حسن تحریر و انشا کا مقام بہر حال حسن عمل کے بعد ہے (ص 145)۔

ندوی صاحب نے مجسمہ سازی اور رقص کو اسلامی ثقافت کے مزاج سے متناقض قرار دیا ہے اور اول الذکر کو تقاضائے توحید کے منافی بتایا ہے' اسی طرح رقص کو طہارت زندگی کا مخالف' تصویر اور نغمہ کی بحث میں ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ فن موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے زور سے 'ا' ۔ قوی عامل بن گیا ہے اور اس کا مقابلہ ممکن نہیں رہا اس لیے اسلام کی اجتہادی قوتوں ۔ ۔ ائدہ اٹھا کر' ان کے استعمال میں ایک نیا انتخابی نقطۂ نظر پیدا کیا جائے تاکہ اسے تعمیر حیات کے لیے استعمال کیا جاسکے (ص 152)۔ مرد و زن کے تعلقات کے سلسلے میں دو اصول فیصلہ کن بتائے ہیں: اول فطرت کے تقاضے؟ دوم پاکیزہ عائلی زندگی اور اعلیٰ مقاصد زندگی کے تقاضے۔ ظاہر ہے کہ یورپ کا عمل اس معاملے میں تباہ کن ہے لہٰذا اس میں مذکورۂ بالا اصولوں کی روشنی میں' اعمال کے دوائر کے بارے میں کچھ لچک پیدا کرنی چاہیے اور حقوق و فرائض کے نقشے میں اساسیات کی روشنی میں توازن پیدا کیا جائے۔

ان سب عالمانہ بحثوں کے باوجود' ندوی صاحب کی کتاب کلچر کے عمل کی روداد نہیں پیش کرتی جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا ہے: "مسلمانوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں تہذیب و تمدن کے کن سانچوں کو اپنایا اور یہ کہ نظریاتی اعتبار سے اسلامی ثقافت کے خط و خال کیا ہیں' ہر اعتبار سے یہ وہ الگ الگ سوال ہیں۔" اور "ہمارے دائرۂ بحث کا تعلق حال اور مستقبل کی کروٹوں سے ہے۔" تو یہ صرف اصولیات کی کتاب ہے۔

Marfat.com

اسی ایک وجہ سے 'میرے لیے کاوش کی گنجائش نکل آتی ہے کہ میں نے اصول کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ اسے کلچر کے خارجی عمل کی روداد بنانے کی کوشش کی ہے۔

کچھ یہ بھی ہے کہ ندوی صاحب نے اس مسئلے کو علم البشر (Anthropology) کے زاویے سے دیکھا ہی نہیں......' میں نے یہ زاویہ بھی استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک بشریاتی زاویہ ایک ناگزیر حقیقت ہے اور نفسیاتی زاویے سے اس کا کسی طرح تصادم نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی اس عالمانہ کتاب میں کلچر کی حدوں کو پھیلا کر سولزیشن تک پھیلا دیا ہے اور میں نے اس کے پھیلاؤ کو محدود کر کے کلچر کو قطعی اور قابل فہم اور قابل گرفت مفہوم میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشری نظریات کو بالکل نہیں چھیڑا نہ میں نے ادارت و نظامات کو بغور خاص موضوع بنایا[1] ہے۔

تازہ ترین کتابوں میں مظہر الدین صدیقی کی انگریزی کتاب:

Concept of Muslim Culture in Iqbal بھی حکیمانہ کتاب ہے مگر دراصل علامہ اقبال کے خطبات (بلکہ ایک خطبے) کی تشریح ہے۔ یہ بھی اصولی کتاب ہے۔ اور اس میں اقبال کی حکیمانہ تعبیر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب کلچر پر نہیں مسلمانوں کے عام زاویۂ نظر کے بارے میں ہے جو قرآن مجید کے زیر اثر انہوں نے قائم کیا۔ بلاشبہ ایک گوشے سے یہ کلچر کی بحث میں داخل ہو جاتا ہے لیکن کلچر پر براہِ راست بحث اس میں موجود نہیں۔

اقبال کے خیالات کا خلاصہ مصنف نے یوں پیش کیا ہے۔

"Iqbal claims that for the purposes of knowledge the spirit of Muslim Culture fixes its gaze on the concrete, the finite, and that the birth of the method of observation and experiment in Islam was due not to or compromise with Greek thought but to a prolonged intellectual warfare with it."

مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اقبال کی نظر میں 'قرآن نے anti-classicism (مخالف یونانیت) نقطۂ نگاہ اختیار کیا۔ عقلیت کو فروغ دیا لیکن عقل عملی و تجربی کو نہ کہ استدلالی کو۔ تصوف کی منفی اور منفعل داخلیت سے احتراز سکھایا' جمہوریت کی وہ روح ابھاری

Marfat.com

جو تقویٰ اور قابلیت کو اکرمیت کی بنیاد قرار دیتی ہے۔ اور اجتہاد کا اصول قائم کر کے مسلمانوں کے فکر و عمل کی راہیں ہمیشہ کے لیے کھول دیں جس سے ان کے تخلیقی و تسخیری جوہر ابدالآباد تک باصلاحیت رہ سکتے ہیں۔ اس عقیدے کے تحت مسلم کلچر کے تین اہم فریضے ہیں: اول اسے مادی قوتوں کی تسخیر کے قابل ہونا چاہیے؛ دوم: اسے سوشل (معاشرتی) قوتوں کی تنظیم کے قابل ہونا چاہیے اور سوم: اسے فرد کو اپنے نفس کو کنٹرول کرنے کے قابل بنانا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ یہ بھی کلچر کا بہت وسیع تصور ہے جو سولزیشن اور اس کے ایک ترکیبی عنصر مذہب و حکمت سے جاملتا ہے جو میرے نقطۂ نظر سے ایک تمہیدی بحث تو بن سکتی ہے مگر میری اصل یہ نہیں۔ میں تو اس سے بحث کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کے کلچر کے خارجی مظاہر کی کہانی کیا ہے؟

1967ء میں ایک عمدہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی مگر قدرے گم نام رہی۔ یہ پشاور کے ایس ایم جعفر کی

(Islamic Culture and its Ideological Basis) ہے۔ اس منفرد کتاب کا دائرہ بحث اور بھی وسیع ہے۔ اس میں لفظ کلچر کے مترادفات، کلچر کی تعریف اور اس کے مختلف تصورات (ہیگل، کارل مارکس، شپنگلر، لیبان، برٹرینڈرسل، ٹوائن بی، پیری رانلڈ بینتھم ڈیورنٹ — البیرونی، ابن خلدون، سید امیر علی، اقبال اور شستری کے خیالات) علم العمران (Science of Culture) کلچر کا وسیع دائرہ بطور طرز حیات، کلچر میں عقیدے کی اہمیت، قبل از اسلام کے کلچر (انبیاء سابقہ کی تعلیمات)، اسلام کا کلچر، کلچروں کا خلط ملط، قدیم کلچروں کا تقابل، مستقبل میں اسلامی کلچر کے امکانات، ایران پر اسلامی کلچر کا اثر — مشرقی و مغربی کلچروں کا مقابلہ۔ یہ کتاب کے ابواب کی سرخیاں ہیں۔ بحث کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ مصنف کے نزدیک کلچر

All that is thought and wrought by man falls within its coverage.

یا مذہب، حکمت اور تاریخ کا مجموعہ ہے۔ جناب جعفر نے اپنی کتاب کو اسی تعریف کے مطابق پھیلایا ہے اور بہت دور دور گئے ہیں۔ ازازل تا ابد! کا اور ان کا یہ تصور Cowell کی تعریف سے ماخوذ ہے جو یہ کہتی ہے کہ صداقت خیر اور اخلاق کو بروئے کار لانے والی ہر شے کلچر ہے دیکھئے اس کی کتاب (Culture in Public and Private)

اس کتاب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں مگر اس کا پھیلاؤ نا قابل گرفت ہے۔

میری نظر میں اس کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں مصنف نے کلچر کو ایک طرز

Marfat.com

حیات(W.ay of LIfe) کہہ کر اس کے مختلف اطوار ظاہر کیے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ طرز حیات کئی راستوں میں پھیل کر' پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے' مثلاً طرز عمل و فعل' طرز گفتگو' زبان و بیان' طرز فکر' طرز احساس و عقیدہ' طرز درست کرداری' طرز معاملہ' طرز ادب مجلسی' طرز بقائے نوع (شادی وغیرہ) طرز تخیل و طرز تحریر (ادب)' طرز تخلیق (فن) طرز تعلیم طرز منصوبہ بندی و طرز تعمیر وغیرہ' طرز پیداوار اشیا (علم الاقتصاد) طرز تعلیم و تعلّم' طرز دفاع ملک (جہاد تنظیم و عسکری)' طرز تحفظ روایات (تاریخ)' طرز تجزیہ اشیائے (سائنس' استدلال فکری و صحت فکر (منطق)' استقرا حکمت۔

اس فہرست پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کلچر کی جامعیت کے قائل ہیں اور اس میں تاریخ مذہب' علوم فنون' آداب' ادارات' تنظیمات' ایجادات و اختراعات ہر شے کو شامل سمجھتے ہیں۔

قدرتی طور سے میرا نقطۂ نظر یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مصنف نے نفسیات اجتماعی اور علم البشر کے حوالے سے کچھ زیادہ توجہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انہوں نے کلچر کے خارجی' وقوع میں آئے ہوئے' ٹھوس نقوش کی روداد نہیں لکھی ــــ یہ بحث خالصتاً نظری اور فلسفیانہ ہے۔

میں اتنی وسعت میں دانستہ نہیں گیا۔ کیونکہ جب بحث اتنی پھیل جائے کہ اس کا دامن پکڑنا مشکل ہو جائے تو عام قارئین کا پریشان ہو جانا یقینی ہے۔

اس سے بھی وسیع تر (مگر معین اور قطعی دائرے میں) ششتری کی انگریزی کتاب

An Introduction to Islamic Culture

(دو جلدیں) ہے۔ مجھے اس کے متعلق یہ شکایت نہیں کہ اس میں کلچر کی قطعی و خارجی جزئیات نہیں' یقیناً اس لحاظ سے اس کتاب میں' نہایت قیمتی مواد ہے۔ طرز حیات بھی ہے جسے Sociology of Islam کا نام دیا گیا ہے اور فنون لطیفہ و مفیدہ کی روداد بھی ہے۔ ذوقیات و تفریحات کا حال بھی ــــ اور مناسب حد تک سیاسی احوال کے اثرات کی تفصیل بھی ہے۔ لہٰذا میں اسے عمدہ ترین کتابوں میں سے سمجھتا ہوں مگر اس میں ایک کمی ہے (جس کی ذمے داری مصنف پر نہیں آتی) اور وہ یہ کہ زوال اور محکومی کے بعد' مسلمانوں کے کلچر پر جو گزری اس کی طرف اشارہ نہیں' نقطۂ نظر خالص مغربی ہے کیونکہ مغربی تہذیب کو مثالی اور معیاری سمجھا گیا ہے اس لیے مسلم کلچر کے زوال کو ایک بہتر کلچر

کی آمد کی نوید سمجھ لیا گیا ہے۔

دو کتابیں اس سے بھی پرانی میرے سامنے ہیں' تاریخ التمدن الاسلامی مصنفہ جرجی زیدان اور تمدن عرب (مصنفہ لیبان مترجمہ سید علی بلگرامی) یہ پیشترو کتابوں میں سے ہیں اور خارجی کلچر کی اچھی روداد پیش کرتی ہیں۔ مگر ذرا پرانی ہیں — ایک اور کتاب بار تھولڈ کی Islamic Culture ہے۔ مختصر مگر عمدہ — نقطۂ نظر تاریخی ہے۔ کمی اس میں یہ ہے کہ انصاف پسندی کے باوجود' وہ جانبداری بھی ہے جو عام مغربی مصنفوں کا شیوہ ہے۔

بلا شبہ یہ بے حد وسیع تعریف ہے اور میری رائے میں' یہ civilization کی مترادف بن جاتی ہے۔

میں نے اپنی موجودہ کاوش میں کلچر کو قدرے محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جالبی مذہب اور علم کے باضابطہ ادارات کو کلچر میں شامل کرتے ہیں۔ مذہب کو کلچر نہیں اس کا سرچشمہ مانتا ہوں اس طرح علم سے متعلق شوق و ذوق کی صورتیں تو کلچر میں شامل ہیں علوم سے کلچر کا بہت ہی خارجی اثر ڈالنے والا ماحول پیدا ہوتا ہے وہ خود کلچر کے اجزائے ترکیبی میں شامل نہیں۔

جالبی نے کلچر کو معاشرے کے باضابطہ عمل کا نام دیا ہے میں اسے معاشرے کے افراد کا کیرنگ مگر آزاد عمل قرار دیتا ہوں' یعنی اسے کسی قانون کے ذریعے نافذ نہیں کیا جاتا۔

جالبی صرف خیالات کے عمل کو کلچر کی پیدائش کا باعث قرار دیتے ہیں میں محض افکار قاہرہ (dominant ideas) کو موجب سمجھتا ہوں۔ جالبی تبدیلی کے اصول پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کو نئے حالات میں بدل جانا چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر نئے افکار قاہر ہوں گے تو آدمی بدل جایا کرتے ہیں۔ اصرار و تبلیغ کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل یہ مغربی افکار کے سامنے زبردستی جھکانے کی تحریک کا ایک حصہ ہے اور یہیں سے اختلافات شروع ہوتے ہیں۔

جالبی کے اور میرے نقطۂ نظر میں فرق یہ ہے کہ وہ اصل سے زبردستی ہٹانے میں یقین رکھتے ہیں اور میں اس معاملے میں قدرتی تبدیلی کا قائل ہوں۔

جالبی کی کتاب کا وقیع ترین حصہ قومی زبان سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی دان طبقے کی بے مغزی اور نقلی کلچر کی قلعی جس طرح کھولی ہے وہ حقیقت میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے انہوں نے پاکستانی کلچر کی تشکیل کے لیے تجویزیں پیش کی ہیں۔

یوں کلچر اپنی وسیع تعریف کی رو سے ایک ایسا موضوع ہے جس کی بحث متعدد

Marfat.com

دوسرے مضامین کی تاریخوں میں آ ہی جاتی ہے' اسلامی فنون لطیف (اور اس کی انواع کی تاریخوں میں) تاریخ کی کتابوں میں' فلسفہ کی تصانیف میں— اور اب تو وہ مذہب' فلسفہ' ادب اور نفسیات Psychology' عمرانیات Sociology بشریات Anthopology بلکہ خود علم حیوانات کی کتابوں میں بھی در آئی ہے اس لیے ان سب پر تبصرہ ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں خاص پاکستان میں لکھی ہوئی کتابوں[2] میں جمیل جالبی کی کتاب Pakistani Culture پاکستانی کلچر قابل ذکر ہے جو 1964ء میں شائع ہوئی تھی۔

میں اس کتاب کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ پاکستانی کلچر کے مسئلے کو سمجھنے کی پہلی دیانتدارانہ مخلصانہ کوشش ہے۔ اس کتاب میں کلچر کی ایک جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جالبی کے نزدیک کلچر اس کل کا نام ہے جس میں مذہب و عقائد و علوم' اخلاقیات' معاملات' معاشرت فنون و ہنر رسم و رواج' افعال ارادی اور قانون صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسان ایک معاشرے کے رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔ اور جن کے برتنے سے معاشرے کے متضاد مختلف افراد اور طبقوں میں اشتراک و مماثلت اور وحدت اور یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرت میں حسن و لطافت' اخلاق میں تہذیب' عادات میں شائستگی— شامل ہیں۔" (ص 49)

لیکن میری گزارش یہ ہے کہ جب تک پاکستان (مسلم) قوم میں خود شعوری پیدا نہیں ہوتی۔ (یعنی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم منفرد قوم ہیں یعنی دنیا میں ہمارا کوئی منفرد نصب العین ہے اور وہ ایسا ہے جو موجودہ اقوام عالم میں سے کسی کے پاس نہیں) اس وقت تک محض غلامانہ طرز بود و ماند سے کوئی منفرد و مخصوص کلچر پیدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقی کلچر کو آپ اصلی تر و تازہ پھول سمجھئے' مانگے تانگے کے کلچر کو آپ باسی یا زیادہ سے زیادہ مصنوعی پھول سمجھ لیجئے۔

پس اس وقت جو طرز ماند و بود (Way of Life) پاکستان کے تعلیم یافتہ اور بورژوا طبقوں کا ہے اسے فرنگی کلچر کی نقل کہنا چاہیے۔

جو طرز ماند و بود قدیم خیال کے متوسط طبقات کا ہے اسے پرانے مسلم کلچر کا پژمردہ سا عکس کہہ ڈالیے۔

جو طرز ماند و بود عوام الناس کی ہے وہ متفرق ہے' اس میں یک رنگی اگر ہے بھی تو بے ڈھنگے پن میں ہے۔ یہ گروہ ہمارے یہاں کسی با معنی و یک رنگ کلچر کے فقدان کا نمونہ پیش کرتا ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ اپنے عوام کو کوئی مانوس اور با معنی

نمونہ دے نہیں سکا اس کی اپنی روش نقل محض ہے اور بسا اوقات حسن اور معنی سے عاری ہوتی ہے' ملک کے عوام اس طرز زندگی سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اعلیٰ اور منفرد کلچر کے لیے' خود شعوری کی ضرورت ہے' محض نقل سے منفرد کلچر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ خود شعوری' اپنی جداگانہ ہستی کے احساس سے پیدا ہو سکتی ہے مگر یہ جداگانہ ہستی' موہنجوداڑو کی تقدیس سے پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ہماری اجتماعی نفسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

حوالہ جات

1. فلپ کے۔ حطی کی کتاب Islam-- a Way of Life
میں دین کا ترجمہ Way of life کیا گیا ہے۔
اس طرح کلچر دین کا ایک شعبہ بن جاتا ہے۔
2. کلچر کے موضوع پر اردو رسائل و جرائد میں بڑی محققانہ بحثیں ہوئی ہیں خصوصاً نیا دور کراچی میں۔

تیرھواں باب

پاکستانی کلچر

"ایک سوال اور اُس کا جواب"

سوال:

ادب کی طرح کلچر کی کوئی حتمی تعریف ابھی تک نہیں ہو سکی۔ قیاس کہتا ہے کہ پس منظر میں کوئی غیر مرئی چیز ہے جسے تخلیقی قوت کا نام دیا جا سکتا ہے اب اس تخلیقی قوت کا تعلق ادب سے تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس قوت کا کلچر سے کیا واسطہ ہے؟ میری رائے میں کلچر اور تخلیقی قوت دو الگ چیزیں نہیں بلکہ کلچر ہی وہ تخلیقی قوت ہے جو ادب کو خوشبو اور پہچان عطا کرتی ہے۔ اس طرح ادب کی تفہیم میں کلچر ایک اساس بن کر سامنے آ جاتا ہے مگر اس کی اپنی شناخت پھر بھی سوالیہ نشان کی صورت جوں کی توں قائم رہتی ہے جس ادب کی تفہیم کے لیے اخلاقی، مذہبی اور عمرانی زاویے موجود ہیں۔ اسی طرح کلچر کو سمجھنے سمجھانے کے لیے جغرافیائی، سیاسی اور مذہبی زاویوں کی بخوبی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن ان پیمانوں نے کلچر کے مسئلہ کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا کر رکھ دیا ہے مشکل وہاں آن پڑتی ہے جب ہم حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے ہیں اور مصلحت میں لپٹی ہوئی خود ساختہ تاویلات میں پناہ لیتے ہیں ہم سب یہ جانتے ہیں کہ کلچر کوئی ایسی جنس نہیں کہ جسے درآمد یا برآمد کیا جا سکے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک ہی ملک میں کئی کلچر پائے جاتے ہیں۔ جب زبان جو کلچر ہی کا ایک مظہر ہے چند کوس کے فاصلہ پر کسی حد تک بدل جاتی ہے تو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں کلچر کا تنوع دیکھنے میں آئے تو یہ کونسی اچنبھے کی بات ہے؟ اس تنوع ہی میں تو کسی ملک کا مجموعی حسن مضمر ہے کہ رنگارنگ پھولوں کے یکجا ہونے سے گلدستہ مرتب ہوتا ہے رہی مذہب کی بات تو یہ کلچر

Marfat.com

سے بھی عظیم تر قوت ہے اس لئے کہ کلچر کی جڑیں تو زمین میں اتری ہوتی ہیں لیکن مذہب کی جڑیں انسان کی روح میں موجود ہوتی ہیں کلچر تو ایک طرح سے وہ مزاج ہے جو اپنے جغرافیائی پس منظر میں بالکل فطری انداز میں پایا جاتا ہے' یہ مزاج اس علاقے کی زبان اور فنونِ لطیفہ میں اظہار پاتا ہے۔ اس بنا پر کلچر کو ایک زندہ تخلیقی قوت سمجھا جاتا ہے۔

کلچر کے ساتھ بالعموم ایک اور لفظ تہذیب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے کثرت استعمال سے یہ لفظ اب کلچر کا مترادف بنتا جا رہا ہے مگر جس طرح اصل اور بہروپ میں حقیقت اصلی اور بہروپ لمحاتی ہوتا ہے اس طرح تہذیب بھی کلچر کا بہروپ ہے۔ بہروپ میں چکا چوند ہوتی ہے اور ظاہر میں اس سراب کو ہی حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میرے نزدیک تہذیب کے لفظ کے ساتھ درآمد برآمد کا تصور وابستہ کیا جا سکتا ہے ملکوں کے مابین فاصلے کے سمٹ جانے کی وجہ سے یہ جنس دنیا کے کونے کونے میں اپنے وجود کا احساس دلاتی نظر آتی ہے اس طرح اب اس کی حیثیت بین الاقوامی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے' آداب خورد و نوش' گفتگو کا پر تکلف انداز' فیشن عریانی اور فحاشی اس کے نمایاں خدوخال ہیں اس تہذیب کو کلچر کے نام سے فنون لطیفہ اور خاص طور پر ادب میں پیش کیا گیا ہے اور یہی صورت حال ہماری فلموں اور تفریحی پروگراموں کی ہے۔ کیا ان میں ہمارا کلچر پیش ہوتا ہے یا یہی بین الاقوامی تہذیب؟ کلچر اور تہذیب کو یوں گڈمڈ کرنے سے بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں تہذیب اور کلچر کے بنیادی فرق کو ایک دانشور نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

کلچر اور تہذیب میں وہی فرق ہے جو بیج کے مغز اور اس کے "چھلکے" میں ہوتا ہے۔ کلچر مغز ہونے کے باعث تخلیق کا منبع ہے جب کہ تہذیب کی حیثیت اس محافظ کی سی ہے جو چھلکے کی صورت میں مغز کی حفاظت کرتا ہے۔ کلچر بنیادی طور پر کومل' گداز' قوت نمو کا خزینہ اور ارتقاء کا محرک ہے جب کہ تہذیب اصولوں اور قدروں' قوانین اور ضوابط' رسوم و رواج کے تابع اور اسی لئے بیضوی پٹی ہوئی اور بے لچک ہے۔

اس اقتباس میں تہذیب کو کلچر کا محافظ قرار دیا گیا ہے۔ بلا شبہ زمانۂ قدیم میں تہذیب کا مفہوم یہی لیا جا سکتا ہے اس لیے کہ ممالک کے درمیان طویل فاصلوں نے ہر ملک کی شناخت اور انفرادیت کو برقرار رکھا تھا۔ ہر ملک کا اپنا کلچر تھا۔ اور اپنی تہذیب تھی۔ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ نہ یہ آپس میں ملے ہیں اور نہ مل سکیں گے۔ یہ مقولہ جس شخص کا تھا اس نے مشرق اور مغرب کی تہذیب کے اختلاف کو پیش نظر رکھ کر پیش کیا تھا اور یہ اس زمانے میں تھا بھی درست۔ لیکن کیا موجودہ زمانہ میں کسی ملک کو بین

Marfat.com

الاقوامی تہذیب سے کٹا ہوا دیکھا بھی جا سکتا ہے؟ اب جو تہذیب مغربی ممالک میں فروغ پذیر ہے وہی کم و بیش مشرقی ممالک میں بھی نظر آتی ہے تہذیب کی اس یلغار سے اب کونسا ملک محفوظ ہے۔ جب بیج کے چھلکے کی تہیں اتنی دبیز ہو جائیں کہ مغز کے وجود کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں تو سطحی نگاہوں کو چھلکا ہی سب کچھ نظر آئے گا یہی صورت ہمارے یہاں ہے۔ جس چیز کو ہم کلچر کا نام دے رہے ہیں وہ حقیقت میں تہذیب حاضر ہے کلچر نہیں قوتِ نمو کو بہروپ سے کیا تعلق لیکن ستم ظریفی یہ کہ ہم بہروپ کو قوتِ نمو کا قائم مقام بنا بیٹھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت سے چشم پوشی نہیں ہے؟

میں نے ابتدائی سطور میں ایک ہی ملک میں کلچر کی رنگارنگی کا ذکر کیا تھا اور آگے چل کر اسے الگ الگ مزاج کا نام دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ایک گھر لے لیجئے۔ یہ چند افراد کی وحدت کا نام ہے اس میں ہر فرد دوسرے سے مزاج میں تھوڑا بہت مختلف ہو گا۔ مگر جب اس گھر کا مجموعی مزاج متعین کیا جائے گا تو اس باہمی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ اس مخصوص رویہ کی نشان دہی کی جائے گی جس سے اس گھر کا مزاج عبارت ہے۔ اس مثال کو ہم اپنے وطن عزیز پاکستان پر منطبق کریں تو پنجاب' سندھ سرحد اور بلوچستان کے مابین تھوڑا بہت کلچرل فرق ہونے کے باوجود بحثییت مجموعی ایک کلچرل وحدت بہر حال موجود ہے۔ پھر اس وحدت کو اسلام کی روحانی فکر اور اردو زبان کی وسعت نے اور بھی استحکام بخشا ہے۔ اس سیدھی سادی اور شریف صورت حال میں اگر ہم علاقائی کلچروں پر خصوصی زور دینا شروع کر دیں تو میرا خیال ہے کہ بات الجھ جائے گی اور ہم کُل کو نظر انداز کر کے جزو کو محفوظ کرنا شروع کر دیں گے۔

لہٰذا کلچر کے سلسلے میں میرا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی کلچر کے خدوخال کو واضح کیے بغیر علاقائی تقاضوں کو سب کچھ سمجھ لینے کا رویہ ہمیں قومی سطح کی شکست وریخت اور بکھراؤ کی طرف لے جائے گا؟ اس کے ساتھ ہی ایک ضمنی سوال یہ بھی ہے کہ کیا کلچر کے بجائے تہذیب کو سب کچھ سمجھ لینے سے فرد کی انفرادیت پر ایک کاری ضرب نہیں پڑے گی اور وہ ایک بہت بڑی معاشرتی مشین میں محض ایک پرزہ بن کر نہیں رہ جائے گا؟

بعض لوگ پاکستانی کلچر کو اس کے تاریخی تناظر سے الگ کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا اور غالب تک کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ تو اس زمین میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے جو آج ہمارے پاؤں تلے ہے۔ لہٰذا ایک ضمنی سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ لوگ بعض ثقافتی جڑوں کو اہمیت دے کر اور بعض کی (اپنی سہولت کے مطابق) نفی کر کے پاکستان کے ثقافتی

افق کو گدلا نہیں کر رہے؟

جواب:

فاضل سوال کنندہ نے قدرے پیچیدہ عبارت میں جس کے بعض مندرجات سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ وقت کے نہایت ہی اہم مسئلے کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔ اس وقت پاکستانی کلچر کے بارے میں خوفناک مغالطے (غالباً کسی نظریاتی غرض و مقصد کے تحت) پھیلائے جا رہے ہیں اور بحث میں بے بنیاد مفروضات کی آڑ لے کر جو خوفناک باتیں کہی جا رہی ہیں۔ ان کے مضمرات کی طرف متوجہ نہ ہونا علمی لحاظ سے بھی درست نہ ہوگا۔

راقم الحروف کو سوال کنندہ کے اس موقف سے تو اختلاف ہے کہ کلچر میں ایک تخلیقی قوت ہے اور یہ تخلیقی قوت (کلچر) تہذیب سے مختلف کوئی شے ہے کیونکہ کلچر اگر تخلیقی قوت ہے بھی تو اس قوت کو کلچر کا داخلی و ذہنی سرچشمہ کہا جائے گا۔ کلچر نہیں کہا جائے گا۔ اسے محض اندرونی محرک اور عامل کہا جائے گا جو بیرونی طور پر اپنی تشکیل کے لیے کسی خارجی مواد کا طلب گار ہے۔ اس لیے کلچر وہ ہے جو اندر کی کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر خارج میں انسان کے اعمال و افعال اور مادّی ماحول میں ظہور پاتا ہے خواہ وہ ظہور افراد کی انفرادی زندگی میں ہو (جیسا کہ قدیم خیال یہی تھا' مثلاً افلاطون کے یہاں تہذیب نفس اور تکمیل نفس کا تعلق فرد سے ہے) یا اجتماع کے اعمال و افعال میں ہو (جیسا کہ جدید سوشیالوجی اور این تھروپالوجی کے علما کا خیال ہے) تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سوال کنندہ نے اس اصولی بحث کے ضمن میں پاکستانی صورت حال کو موضوع تحقیق بنانے کی اہمیت جتلا کر ایک بڑے ہی نازک اور اہم سوال کی وضاحت کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت جو لوگ پاکستانی کلچر کی نظر ثانی توضیح و تشریح میں مصروف و منہمک ہیں وہ اس کثرت تعبیر سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جو علم کی کتابوں میں کلچر کے ضمن میں پائی جاتی ہے' کیونکہ اس لفظ کی کوئی جامع و مانع تعریف ابھی تک نہیں ہو سکی (Kroeber) نے اپنی کتاب میں اس کی 121 تعریفیں درج کی ہیں مگر ان میں تسلی بخش کوئی ایک بھی نہیں۔ اس کثرت سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک کے نظریاتی محقق بقدر ظرف و استعداد دل کھول کر مغالطے ابھار رہے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں کلچر کبھی محض فنون لطیفہ (بالخصوص مصوری' موسیقی اور رقص) کبھی محض شاعری اور ڈراما کبھی محض ذوقیات کبھی محض تفریحات

Marfat.com

اور کبھی محض رسوم و رواج اور محض معاشرتی زندگی---اور گاہے محض علمی و تخلیقی مظاہر و آثار (جن میں مذہب کو شامل کر لیا جاتا ہے) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ کلچر ان سب کا جامع ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک مذہب کلچر کا حصہ نہیں کلچر کا سرچشمہ ہے۔

اس اختلاف کے پیش نظر ہمیں ایک سادہ اور علمی سی تعریف خود وضع کر لینی چاہیے۔ جو لاتعداد تعریفات کی نمائندگی بھی کر سکے اور پاکستانی کلچر کی خاص بحث میں علمی طور سے مفید بھی ثابت ہو۔ اگر ہم کلچر کو (اس خاص بحث کی خاطر) انسان کی کل تخلیقی و تنظیمی قوتوں کے مظاہرہ و آثار سمجھ لیں تو بہت سے اشکالات دور ہو سکتے ہیں۔ انسان کے باطن میں پانچ بڑی قوتیں کارفرما ہیں۔ (1) روحانی و جدانی؛ (2) ذہنی و فکری؛ (3) تخیلی و تخلیقی و ذوقی؛ (4) تنظیمی اور عقلی تجربی اس وقت ہم اگر یہ سمجھ لیں کہ تمام وہ مظاہر جو تخلیقی و تنظیمی قوتوں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں انہیں کلچر کہا جا سکتا ہے تو بہت آسانی رہے۔ گی۔ یہ یاد رہے کہ بحث صرف مظاہر سے ہے نہ کہ ان کے محرکات و تصورات سے جو ذہن میں پوشیدہ ہیں۔ یا ان عوامل سے جو مادی حول میں موجود ہیں۔ محرکات و عوامل کو ہم کلچر کے سرچشمے اور خارجی مواد کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کے اجتماع سے کلچر کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس صورت میں لفظ کلچر میں تمام مجلسی ذوقی رویے اور تخلیقی عمل اور وہ تمام معاشرتی عادات شامل ہو جاتی ہیں جو آزادانہ رضاکارانہ ظہور میں آتی ہیں جن میں قانونی جبر موجود نہیں ہوتا۔ یہ صرف افراد تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے گروپ اور معاشرے کی عادات ہوتی ہیں جو کسی جبر کے بغیر محض اجتماعی نفسیات کے دباؤ سے آزادانہ رضاکارانہ بلکہ خوشدلانہ 'اجتماع کے افراد سے برضا و رغبت توسیع زندگی کے لیے بالغرض تفریح و مسرت اندوزی ظہور میں آتی ہیں۔ ان میں جبر نہیں ہوتا لیکن جب ظہور میں آتی ہیں تو ان میں اجتماعی یکسانی و یک دلی (جو ضروری نہیں کہ جدت و نادرہ کاری کے خلاف ہو) موجود ہوتی ہے اور اپنی صورت پذیری میں 'ان میں حُسن' سلیقہ اور تناسب کی شان ہوتی ہے۔

کلچر کے اس دائرے کو اگر تھوڑا سا وسیع کر لیا جائے تو اس میں تمام معاشرتی و سماجی رسوم و روایات بھی شامل ہو سکتی ہیں بلکہ بعض لوگ جملہ ادارات و نظارات اور علم و تحقیق کی عادات اور اذواق کو بھی اس میں شریک کر لیتے ہیں بشرطیکہ ان میں ذوقی روّیہ موجود ہو یعنی ان میں نظم ہم آہنگی' سلیقہ اور مسرت آفرینی کے عناصر شامل ہوں اور قانون اور جبر کا عمل ان کی مسرت آفرینی کو ختم نہ کر دے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے اس تعریف کے ذریعے کلچر کا مفہوم بہت

Marfat.com

وسیع کر دیا ہے میں نے شہری اور دیہاتی کلچر (معاشرتی رویّے) کے فرق کو بھی دور کر دیا ہے نیز اس تعریف کو بھی رد کر دیا ہے جو یہ کہتی ہے کہ کلچر انسان کی تسخیر فطرت کا اور سولزیشن انسان کے تسخیر خود کا عمل ہے (یہ تعریف مانسوسکی نے کی ہے)۔

میں نے کلچر کے جس تصور کو پیش کیا ہے کہ اس میں تسخیر ماحول' اور تسخیر نفس کے ذریعے ایک مکمل اسلوبِ حیات کا تصور دیا ہے جس میں ہر وہ شے شامل ہو سکتی ہے جس میں قانون کا ساخیر نہیں۔ اس لیے کلچر فنون' موسیقی مصوری تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں تمام مجلسی اخلاقی تمام تخلیقی اور حسن آ[illegible] نظیمی اعمال وافعال —اور دیگر جملہ حسین اذواق و مظاہر شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ تعر[illegible] چر کو سولزیشن کی حد میں لے جاتی ہے لیکن اس میں کوئی مضائقہ نہیں' سولزیشن کی حد پھر بھی خاصی وسیع رہتی ہے۔ اس میں شہروں کی معموری جس کے لیے قانون کا سہارا لینا پڑتا ہے اہم درجہ رکھتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ کلچر ہر سولزیشن کا حصہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر کلچر سولزیشن کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

میں نے اس خیال کو بھی کہ کلچر میں موروثی عادات شامل نہیں' تقریباً مسترد کر دیا ہے۔ کلچر تو ہوتا ہی وہ ہے جو نسلاً بعد نسل کے عمل و تعامل سے شکل پذیر ہو۔ میں این تھروپالوجی والوں کے اس خیال سے متفق ہوں کہ کلچر انسان کے ماحول ثانی کا نام ہے اور ماحول ثانی مسلسل ارتقا کرتا رہتا ہے مگر ان کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ یہ محض ضروریات و حاجات کی تکمیل کے عمل کا مظاہرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلچر مادی ماحول میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے اور حسن پیدا کرنے والی قوت انسان کے باطن میں ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ میں مادی عوامل اور جغرافیائی و طبعی ماحول کے علاوہ مذہب واخلاقیات کو بھی (جو انسان کی روحانی وجدانی قوت کے ظہور کا نام ہے) کلچر کی تشکیل میں نہایت مؤثر مانتا ہوں۔

بعض اوقات کلچر کی محدود تعریف بھی مفید اور کار آمد ہوتی ہے لیکن میں نے اس وقت کلچر کی وسیع ترین تعریف کو پیش نظر رکھ لیا ہے کیونکہ پاکستان میں جہاں دین اسلام ایک مذہب عامہ ہے اور جس کی رو سے زندگی کے کل اجزا باہم مربوط اور بیک وقت عمل آفرین ہوتے ہیں یہی جامع تشریح ہمارے عملی مقاصد بحث کے لیے مفید ہو گی۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان میں فنون لطیفہ' معاشرتی رسوم و رواج' مجلسی ذوقیات و تفریحات اور حسین تنظیمات زندگی کا حال' ماضی اور مستقبل کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں سوال یہ ہے کہ پاکستانی کلچر کیا اور اس کا تشخص کیا ہے؟

Marfat.com

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی کلچر کے تشخص کے بارے میں موجودہ غوغا اور تجہیل و تجاہل محض اس غرض سے ہے کہ ہمارے بعض احباب مسلم کلچر کی اصطلاح یا اس کے اطلاق سے بچنا چاہتے ہیں حالانکہ پاکستان و ہندوستان کی کشمکش کی پس منظر میں اس کے اختیار کر لینے میں ہزار آسانیاں تھیں یعنی ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ ہندوستان میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے اس کا غالب کلچرل رنگ ہندوانہ ہے اور پاکستان میں اکثریت چونکہ مسلمانوں کی ہے اس لئے اس کا غالب کلچرل رنگ مسلم معاشرت اور تاریخ سے پیدا شدہ ہے— لیکن احباب بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے پسند نہیں کرتے اب وہ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا کلچر ہندوانہ ہے (اگرچہ پچھلی ارتقائی معاشرتوں کی تقدیس سے یہ خود بخود لازم آ ہی جاتا ہے کہ ہمارا کلچر کوئی ایسی شے ہے جو اصنامی ادوار کو مقدس مانتا ہے۔ آپ اسے برملا ہندوانہ طرز احساس نہیں کہیں گے۔ تاہم دراوڑی اور آریائی عناصر کو مقدس ماننے سے بات تقریباً وہی ہو جاتی ہے لیکن یہ حضرات مصلحتاً یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہندوانہ اصنامی دراوڑی آریائی) کلچر کو پھر سے اہمیت دینا چاہتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ ہم علاقائی کلچروں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور یہاں پھر دانستہ یہ سچی بات ان کے قلم سے نکل ہی جاتی ہے کہ علاقائی کلچر مسلم کلچر سے الگ کوئی شے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ علاقائی کلچر مسلم کلچر سے الگ کوئی شے نہیں، فرق صرف کُل اور جز کا نہیں بلکہ ماہیت کا بھی ہے۔ موجودہ علاقائی کلچر اپنی آخری شکل میں مسلمانوں کے تمدنی تجربے سے گزر کر— اور اخذ و انتخاب کے عمل کے معیار پر اتر کر، اپنی شکل اور ماہیت دونوں کے اعتبار سے مسلم کلچر ہو چکے ہیں علاقوں میں تھوڑے تھوڑے طبعی احوال، اور بعض ضمنی عوامل کی وجہ سے فرق ہیں ورنہ پاکستان کے سب علاقائی کلچر مسلم تمدن کے مظاہر ہیں۔ ہمارے نظریاتی محقق اس بات سے اچھی طرح باخبر ہیں لیکن سفسطہ سے کام لے رہے ہیں اب ان کی تکنیک یہ ہے کہ اجزا کو بنیادی بنا کر کل کو یا تو مبہم بنا دیا جائے یا مطلقاً اس کا انکار کر دیا جائے۔ اور ضرورت ہو تو کسی نئے اصول اور نظریے کی بنا پر پھر ان اجزاء کی شیرازہ بندی کی ناکام کوشش کی جائے۔ اس طرح پاکستان میں کسی مسلم کلچر کے وجود کی نفی کر کے اسے حسب ضرورت کسی بین الاقوامی نظریاتی کلچر سے رشتہ بند کر دیا جائے۔ اور مقصد یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے تمدنی عمل اور تجربات کو اذہان سے بالکل نکال دیا جائے۔

یہ محض بدگمانی نہیں حقیقت ہے جس کے ایک سے زیادہ شواہد موجود ہیں مگر میں

Marfat.com

اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔

بناء بریں پاکستان میں پاکستانی کلچر نام کی کوئی معین اور قطعی شے ہو یا نہ ہو پاکستان میں اب تک مسلم کلچر کی جڑیں گہری ہیں۔ علاقوں میں بھی اور بہ حیثیت مجموعی پورے ملک میں بھی — اجزا میں بھی اور کل میں بھی اور اگر ہم حال کی گھڑی میں پاکستان کے کسی غالب کلچر کا ذکر ضروری سمجھیں تو اسے مسلم کلچر ہی کہیں گے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم تمدن (جہاں تک اس کے عملی تجربوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے) علاقائی صورتِ حال کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ بالکل فطری سلسلہ عمل کے مطابق علاقوں کی جغرافیائی طبعی اور تاریخی حقیقتوں کا اعتراف کر کے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے البتہ ان حقیقتوں میں ایک نئی معنویت پیدا کرنے کے لیے اپنے بعض عقیدوں اور سماجی اخلاقیات کو اس میں شامل کر لیتا ہے جس کے باعث کچھ عناصر پر پابندی لگ جاتی ہے۔ بعض میں ترمیم کر لی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر کو جوں کا توں جذب کر لیا جاتا ہے۔ بہر حال مسلم کلچر کے تنوعات میں علاقے کا ذوقی و تخلیقی مزاج خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام تطہیر کا عمل ضرور کرتا رہا ہے مگر علاقوں کے مزاج کو فطرت کی ایک لازمی حقیقت جان کر علاقائی مواد کو ہمیشہ استعمال میں لاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم کلچر میں کثرت بھی ہے اور وحدت بھی۔ ادبی وحدت بھی ہر جگہ ہے لیکن تنوعات بھی ہر جگہ ہیں۔ یہی مسلم کلچر کی خصوصیت ہے۔

مسلم تمدن کا یہ عمل دنیا کے ہر ملک میں یکساں ہوا۔ اسی وجہ سے مسلم تمدن کو بین الاقوامی اور بین العلاقائی کہا جاتا ہے اور اس تمدن کے اس مخصوص طریق کار سے یورپ اور امریکہ بے حد متعجب ہیں کیونکہ یورپ جہاں جاتا ہے بجبر یک رنگی کو نافذ کرتا ہے اور یہ اس کے بے حوصلہ ہونے کی علامت ہے۔ مسلم کلچر اس جبر کا قائل نہیں۔

مسلم تمدن کے لیے علاقائی کلچر کوئی اجنبی شے نہیں' اس کی نظر میں زبان اور رنگ اور جغرافیائی تنوعات آیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلم تمدن نے ان تنوعات کے سلسلے میں کبھی یک رنگی پر اصرار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی مسلم اقوام میں لباسوں کی رنگا رنگی' مظاہر کا تنوع اور اخلاقیات طبعی کی ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔

ع اے ذوق اختلاف سے ہے رونقِ چمن

لیکن اس تنوع پسندی کے باوجود مسلم تمدن میں بعض مشترک نقوش پر بڑا اصرار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اخلاقیات سے متعلق کلچرل رویے مشترک ہیں' بلکہ ذوقیات کا خاصا حصہ

Marfat.com

دنیا بھر میں مشترک رہا ہے۔ یہ ان عقیدوں کی دولت ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں اثر انداز ہوئے اور ساری دنیا میں ایک کلچرل برادری وجود میں آئی جس میں چند بنیادی عقائد پر بڑا اصرار کیا گیا' مثلاً توحید' طہارت' متانت' مقصد' حفظِ حیات' حیاداری اور وقار انسانی مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال انگریزوں کے زمانے سے پہلے ایک ایسی کلچرل صورتحال برصغیر پاک وہند میں موجود تھی بلکہ 1947ء تک نمایاں نقوش اسی قسم کے تھے۔ اگرچہ 1857ء کے بعد برصغیر میں ایک نیا کلچر جسے یورپین کہیے ظہور میں آچکا تھا اور ہر جگہ اپنا رسوخ بڑھا رہا تھا۔

جب 1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہ کلچرل صورتِ حال پاکستان کو ورثے میں ملی جس کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ پاکستان میں کلچر کے دو دھارے چل رہے ہیں۔ ایک مسلم کلچر کی اس شکل کا جو 47ء میں ورثے میں ملی اور دوسرا دھارا اس یورپین کلچر کا جو 47ء میں موجود تھا اور اب ترقی پر ہے' لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ملک میں کوئی ایسی شے بھی ہے جسے مخصوص پاکستانی کلچر کہا جا سکے۔ اس وقت کا پاکستانی کلچر انہیں دو عناصر سے مرکب ہے۔

یہ معلوم ہے کہ پاکستان کی عمر کم و بیش اٹھائیس سال ہے' اس عرصے میں کچھ کچھ نئے مخصوص رجحانات ضرور پیدا ہوئے ہیں مگر کوئی معین نیا کلچر ان اٹھائیس برسوں میں ایسا پیدا نہیں ہوا جس کے لیے مسلم کلچر سے الگ کسی پاکستانی کلچر کی منفرد اصطلاح جائز سمجھی جائے۔ منفرد کلچر ایک طویل عمرانی سلسلہ عمل سے پیدا ہوتا ہے اور پاکستان کو ابھی اس کا موقع نہیں ملا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاصے طویل تجربوں کے بعد جب اس کے کسی مخصوص تصور زندگی یا مخصوص عقیدوں کے زیر اثر اس کے مظاہر زندگی میں کوئی منفرد معنویت پیدا ہوگی تو اس وقت اس کے تمدنی تجربے کو پاکستانی کلچر کہنا جائز ہوگا۔

فی الحال تو صورتِ حال فقط یہ ہے کہ پاکستان میں کلچر کی دو لہریں بیک وقت چل رہی ہیں۔ ایک لہر اس مسلم کلچر کی ہے جو ایک ہزار سال کی وراثت کے طور پر 1947ء میں پاکستان کو ملی اور دوسری لہر اس یورپین کلچر کی ہے جو 1857ء کے بعد برصغیر میں فروغ پذیر ہوا۔

میں نے اس ضمن میں پاکستانی علاقوں کی پرانی دراوڑی آریائی معاشرتوں کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ معاشرتیں دراوڑی آریائی یونانی کے تصادم اور باہمی جذب و انجذاب سے' پھر بعد میں آنے والے عظیم کلچر کے تسخیری اثر سے ترمیم یا تبدیل ہو کر ایک نئی شکل اختیار

Marfat.com

کر چکی ہیں لہٰذا ان کے علاقائی رنگ بدلی ہوئی صورت میں مسلم کلچر میں سما گئے ہیں اور اب انہیں کسی مستقل نام سے یاد کرنا تاریخی تمدنی قانون کی رو سے درست نہ ہوگا۔ اب صحیح معنوں میں پاکستان میں کوئی پرانا کلچر موجود نہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستانی علاقے میں بعض پرانے شہر نکل رہے ہیں اور اصنامی دور سے متعلق بت اور مجسمے بر آمد ہو رہے ہیں مگر ان کی حیثیت کسی زندہ کلچر کی نہیں۔ اس کے علاوہ ان کو مقدس ماننے والے لوگ موجودہ ہندوستان میں بھی ہیں لہٰذا ان کا پاکستان سے مخصوص تعلق نہیں اور یہ بالکل طے ہے کہ مختلف علاقوں کے مختلف نام نہاد پرانے کلچر مسلم کلچر کے سامنے فنا ہو کر یا اس میں جذب ہو کر' اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ کچھ لوگ ہم میں ایسے ہیں جو گڑے مردے اکھاڑ کر قلب ماہیت کے عمل میں مصروف ہیں۔

بہر حال پاکستان میں اس وقت کلچر کی دو شکلیں ہیں ایک مسلم کلچر (جو ملک کی وسیع دیہاتی قصباتی آبادیوں کا معمول بہ ہے) اور دوسرا یورپین کلچر جو شہری امیروں اور دانشوروں کے ایک مؤثر طبقے میں مقبول ہے اور بلاشبہ فروغ پا رہا ہے۔

اس وقت ان دونوں میں تصادم اور پیکار جاری ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بالآخر ان میں سے کس کو غلبہ حاصل ہوگا۔ تاہم موجودہ حالت میں مسلم کلچر اور یورپین کلچر دونوں کے حق میں دلیلیں موجود ہیں۔

یورپین کلچر کے ممکن غلبے کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بے پناہ چکا چوند ہے۔ چنانچہ مسلم ممالک کے ایک بڑے حصے نے اس چمک دمک کی وجہ سے اسے اختیار کر لیا ہے۔ اس میں ترغیبات اور مرغوبات کی کشش زیادہ ہے' تعلیم و تربیت اور تشکیل اخلاق کے سب ادارے (ادب' سینما' ریڈیو' ٹیلی ویژن) اس کے حق میں تبلیغ کر رہے ہیں اور ٹیکنالوجی کی جملہ آسائشیں اور سہولتیں اس کے ممد و معاون ہیں۔

لیکن مسلم کلچر کے دوبارہ توانا ہونے کے حق میں بھی کچھ دلیلیں ہیں' مثلاً ملک کے کروڑوں عوام میں مذہبی احساس ابھی خاصا طاقت ور ہے۔ اسے صرف نئی معنویت کا احساس یا اشارہ چاہیے۔ پاکستان میں دیہاتی آبادی زیادہ ہے جو یورپین کلچر کی خرافات اور شہ خرچی کو برداشت نہیں کر سکتی نہ اس کی معنویت اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے' زرعی معیشت کی موجودگی بھی اس کے حق میں جاتی ہے۔ عوامی تحریک کا ابھرنا بھی ایک عنصر ہے' یعنی عوام کو کسی وقت بھی یہ کہہ کر ابھارا جا سکتا ہے کہ یورپین کلچر امرا اور بورژوا طبقے کا طرز معاشرت ہے' اس کے علاوہ وہ شدید ردعمل جو خود یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ہپی کلچر کی صورت میں

Marfat.com

یورپین کلچر کے خلاف ظاہر ہو چکا ہے۔ پاکستان میں بھی مقامی اور دیسی کلچر کے حق جا سکتا ہے ــــ اور بالآخر پاکستان کو یہ بھی تو ثابت کرنا ہو گا کہ قائداعظم کا یہ اعلان درست تھا کہ مسلمان قوم کا ایک مستقل کلچر ہے۔ پاکستان کے علاقوں کی مردہ اصنامی معاشرتوں کی دلیل سے تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اصنامی معاشرت کے معاملے میں تو ہندو بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ پھر قائداعظم کے تصور کے کلچر میں ہندوؤں کا اشتراک کس طرح مقصود ہو سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں سوال کا جواب دیتے دیتے' مقالہ لکھنے لگ گیا ہوں مگر اس تطویل کے بغیر میں مستفسر کے پیچیدہ سوال کا جواب اطمینان بخش طریقے سے دے ہی نہیں سکتا۔

کہہ میں یہ رہا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں کلچر (طرز زندگی) کے دو رنگ متوازی چل رہے ہیں اور ان میں بظاہر تصادم کی کیفیت ہے۔ اور فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے' لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' یہ تصادم بھی دراصل اس دانشور طبقے کا پیدا کیا ہوا ہے جس نے اس وقت مسلم کلچر اور علاقائی کلچر کے مابین لڑائی کرا رکھی ہے ورنہ اگر غور کیا جائے تو مسلم کلچر میں تصادم نہیں۔ مسلم کلچر میں وہ قوت اب بھی ــــ وجود ہے جو دوسرے کلچروں کو جذب کر لیتی رہی ہے اور اب بھی اپنے آزمودہ تمدنی تجربے کے مطابق فرنگی کلچر کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ مسلم کلچر کے لیے فرنگی کلچر بھی (بعض خاص ناگوار عناصر سے قطع نظر) اتنا اجنبی نہیں جتنا بظاہر سمجھا جاتا ہے اور یہ تو معلوم ہے کہ مسلم کلچر اپنی سرشت میں بین الاقوامی ہے لہٰذا یورپین اقوام کے کلچر کو بطور خاص اس کے متخالف کیوں سمجھا جائے۔

اگر آج ہم دیانتداری سے یورپین کلچر کے عمدہ مظاہر کا (نہ کہ اس کی خرافات کا) تجزیہ کریں تو ہمیں فرنگی کلچر کے مظاہر کے ایک بڑے حصے پر اعتراض نہ ہو گا۔ اسی طرح جس طرح ہمیں وسطی ایشیا کے تورانی ایرانی کلچر اور ترکستانی چینی اثرات وغیرہ پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان نئے اثرات کو مسلم کلچر کی معنویت میں ڈبونے کی ضرورت ہو گی۔ اور وہ معنویت مسلم کلچر کے عقبی عقیدوں کو سمجھنے سے ہو گی اور میرا خیال ہے کہ زود یا بدیر مسلمانانِ پاکستان اس امتزاج کی ضرورت محسوس کریں گے۔ پھر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ یورپی کلچر بھی اس وقت پاکستان میں ایک نئی قسم کی یک رنگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ مسلم کلچر کی روح کو اس یک رنگی پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ اس سے اسلامی عقیدوں کی معنویت متاثر نہ ہو۔ اس کے برعکس نام نہاد علاقائی کلچروں پر زور دینے سے (جو افتراق انگیز عمل ہے) یہی بہتر ہے کہ یورپین کلچر کی یک رنگی کو وحدت شکل و عمل کا وسیلہ بنا لیا جائے کیونکہ یہ لازماً مسلم کلچر سے متخالف نہیں اور ایک معنویت کے تابع قطع و برید

سے مسلم کلچر کے بین الاقوامی تصور سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تنقیدی عمل کو صحیح طرح کام میں لایا جائے تو مسلم کلچر اور فرنگی کلچر میں اصولی طور سے کوئی تصادم نہیں ــــ اور اصولی طور سے میرا مطلب یہ ہے کہ اصولاً اسے غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا البتہ اگر اس کے ساتھ مغرب کا مخصوص تصور زندگی اور اس کے آبرد باختہ مظاہرہ بھی آجاتے ہیں تو اس کا مسلم کلچر میں جذب ہونا ممکن نہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ اس میں اسلامی تصور زندگی داخل کر لینا ناممکن کیوں ہے' یہ مغرب پسند طبقے کی خوئے غلامی' سہل نگاری اور خود باختگی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ضروری نہیں سمجھتا اور ہر شے کو قبول کرتا جاتا ہے۔

بہر حال فرنگی کلچر کی صحت مند حصوں کو جذب کر لینے سے (کلچر عمل کے خاص قانون کے تحت) مسلم کلچر میں توانائی پیدا ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے اخذ و انتخاب کا اصول بامعنی ہونا چاہیے۔ لہٰذا تصادم کے بجائے میں انجذاب کے امکانات زیادہ دیکھ رہا ہے۔ بالآخر پاکستان جیسے ملک میں (اس کی نظریاتی روح کے تقاضے کے تحت) ایک توانا تر مسلم کلچر نموپذیر ہو سکتا ہے جو اپنی معنویت کے ساتھ ساتھ باہر کے عناصر سے بذریعہ انجذاب توانائی حاصل کر سکے۔

ان تصریحات کی رو سے میں نے سوال کنندہ کے اس اندیشے کا ازالہ کر دیا ہے کہ موجودہ زمانے میں کسی ملک کو بین الاقوامی تہذیب سے کٹا ہوا دیکھا نہیں جا سکتا۔ اگر اصول و انتخاب درست ہو تو مسلم کلچر کے لیے کوئی بیرونی تمدنی مظاہرہ اجنبی نہیں ہو سکتا۔ اسی اصول اخذ و انتخاب کی مدد سے اخلاق باختگی' عریانی و جنسیات کے اس طوفان کو روکا جا سکتا ہے جس کے خلاف اب خود یورپ میں رد عمل شروع ہو چکا ہے۔ برائی مشرق کی ہو یا مغرب کی برائی ہی ہے ــــ شرط یہ ہے کہ ہم کلچر کی بات کرنے والے محض اور زندگی دشمن عادتوں کو خود بخود چھوڑ دیں گے لیکن اگر ہم اپنی مخصوص معنویت ہی نہیں رکھتے تو کلچر کی بات ہی لغو ہے۔ دام و در کو زیبا نہیں کہ وہ کلچر کی بات کریں۔

فاضل سوال کنندہ کی ایک بات کا جواب ابھی باقی ہے۔ انہوں نے دریافت کیا ہے کہ کیا پاکستانی کلچر کے خد و خال کو واضح کرنے کے بغیر علاقائی تقاضوں کو سب کچھ سمجھ لینے کا رویہ ہمیں قومی تقاضوں کو شکست و ریخت اور ٹکراؤ کی طرف تو نہیں لے جائے گا؟

اس کا ایک جواب تو خود فاضل مستفسر نے یہ کہہ کر دے دیا ہے کہ "پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان کے مابین تھوڑا بہت کلچرل فرق ہونے کے باوجود بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک کلچرل وحدت بہر حال موجود ہے۔ پھر اس وحدت کو اسلام کے روحانی

Marfat.com

فکر اور اردو زبان کی وسعت نے اور بھی استحکام بخشا ہے اور اس سیدھی سادھی اور شریف صورتحال میں اگر ہم علاقائی کلچروں پر خصوصی زور دینا شروع کردیں تو میرا (سوال کنندہ کا) خیال ہے کہ — ہم کل نظر انداز کر کے 'جز' کو محفوظ کرنا شروع کردیں۔"

جواب بالکل واضح ہے تاہم کوئی معترض ان چاروں صوبوں میں بیان کردہ کلچرل وحدت کی مزید وضاحت طلب کرے تو وہ حق بجانب ہوگا یہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ چاروں صوبے مسلمانوں کے صوبے ہیں لہٰذا ان کی زندگی و معاشرت کا ایک بڑا حصہ خود بخود ایک مشترک نقش کا حامل ہو جاتا ہے ظاہر میں عبادت کے طریقے' پرسنل لا سے پیدا شدہ نظام خاندان و وراثت' شادی بیاہ کے بنیادی طریقے (جن کی تفصیلات میں تھوڑا تھوڑا فرق ہر جگہ ہو سکتا ہے) طعامیات میں حلال و حرام کی یکسانی' ادبی و شعری اذواق' مجلسی تقریبات و مشاغل' بزرگوں کے عرس' مقابر و مزارات کا احترام مکانات و عمارات کی وضع قطع اور زندگی کے متعلق بیشتر تصورات سب میں مشترک ہیں۔

اب بظاہر جن باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہیں (1) زبان؛ (2) تفریحات کے بعض طریقے؛ (3) لباسوں کے معمولی فرق؛ (4) بعض ادبی و شعری روائتیں اور (5) موسیقی و رقص کے انداز میں جزوی فرق' میں نے اختلافات کی فہرست مصلحتاً پھیلا دی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نمایاں اختلاف صرف زبان کا ہے جسے تسلیم کیا جا سکتا ہے' باقی اختلافات جزوی ہیں کیونکہ ان میں بھی اشتراک کی صورتیں اختلاف کی صورتوں سے زیادہ ہیں اور میں زبان کو کلچر میں شامل بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ کلچر وہ ہے جو زوال پذیر بھی ہو سکتا ہے اور رہٹ بھی ہو سکتا ہے مگر زبان زندہ رہتی ہے — لہٰذا مذہب کی طرح زبان بھی کلچر نہیں کلچر کا سرچشمہ ہے۔ عالم اسلام میں زبانوں کے اختلاف کے باوجود کلچر کی وحدت موجود رہی ہے۔ بہر حال یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ان علاقوں کا تاریخی پس منظر ایک ہے۔ ایک ہزار برس سے ان پر جن کلچروں کا غلبہ رہا ہے وہ عرب' ایران اور توران کے فاتحین کو فتوحات کے اثر سے یکساں طور سے متاثر ہوئے۔ جس طرح زبانوں' خطوں' پہاڑوں اور دریاؤں کے خطوط فاصلہ کے باوجود سارے یورپ کا کلچر ایک ہے۔ اس طرح سارے دریاؤں' پہاڑوں' نسلوں اور زبانوں کے باوجود موجودہ پاکستان کے سب خطوں کا کلچر اصولاً ایک ہے۔

ان خطوں کی سب زبانیں عربی' فارسی اور ترکی سے یکساں طور سے متاثر ہوئیں چنانچہ ان سب زبانوں میں بیس فی صد سے ساٹھ فیصد تک عربی فارسی ترکی الفاظ ایک مشترک نقش پیدا کرتے ہیں ان سب زبانوں کے باوجود ان علاقوں میں ایک ہزار سال تک

Marfat.com

مقامی مصنف عربی اور فارسی میں کتابیں لکھتے رہے جن کے مضمون اور اسلیب مشترک رہے اور تقریباً دوڈھائی سو سال گزشتہ میں ان سب خطوں میں اردو میں لکھنے والے مقامی شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ اور اس حقیقت نے بھی نقش مشترک کو محکم بنایا۔

ہمارے یہاں کا ایک گروہ ان چاروں میں چار مختلف زبانوں کے فرق کا ذکر تو کرتا ہے لیکن اس نے آج تک اس مشترک روح مضمون کا تذکرہ نہیں کیا جو ان چاروں زبانوں کا کلاسیکی ادبوں میں نمایاں طور سے موجود ہے۔ پشتو' سندھی' پنجابی اور بلوچی کی صوفیانہ شاعری منظوم داستانیں اور دینی ادب اسّی (80) فیصد مشترک ہے جس نے فارسی ادب سے کھل کر فیض پایا ہے ان کے ادا کے طریقے۔ ہر زبان اور خطے کے مزاج کے مطابق ہیں لیکن ہر ایک میں اسالیب یہاں تک کہ ترجمہ شدہ محاورے اور استعارے بھی یکساں ہیں۔ داستانوں اور صوفیانہ کہانیوں کی کرداریت بھی مماثل ہے۔ اور اس لحاظ سے اردو بھی ان زبانوں کی برادری میں آ جاتی ہے کہ اس کی کلاسیکی شاعری کے صوفیانہ اور دینی حصے بھی مذکورہ زبانوں کے ہمرنگ اور عربی و فارسی ادب کے فیض یافتہ ہیں اور بعض اوقات مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ محمود بحری کی من لگن گویا حضرت بھٹائی کی بعض منظومات کا عکس ہے۔ کافی کی صنف اکثر پاکستانی ادبوں میں یکساں ہے۔ پنجابی کی سی حرفیوں میں وہی روح ناطق ہے جو رحمان بابا کے کلام میں ہے اور پھر سب علاقے کے اولیاء و صلحا بھی ہیں جن سے سب مسلمانوں کو مشترک عقیدت ہے۔ اگرچہ اب انہیں محض علاقائی بنایا جا رہا ہے۔

میرے نزدیک پاکستان کی زبانوں کی مشترک معنوی روح مزید تحقیق کا ایک عمدہ موضوع ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے یہاں لوگ اشتراک واتحاد کے وجود پر زور دینے کے بجائے معمولی و جزوی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور علیحدگی و تفریق کے انتظام میں منہمک ہیں ورنہ ان چاروں بلکہ پانچوں زبانوں کے کلاسیکی ادبوں میں ساٹھ سے اسّی فی صد تک معنوی اشتراک ہے۔

اس کے علاوہ موسیقی و نغمہ میں اختلافات پر جس طرح زور دیا ہے وہ بھی مبالغہ آمیز ہے — ان میں باہمی فرق اتنا ہے جتنا ایک ماں باپ کے مختلف بیٹوں کی آواز میں ہوتا ہے — اور یہ امر قدرتی ہے — درحقیقت یہ تنوع زندگی کے لیے باعثِ ہزار لطف ہے۔

اور جب ہم ایک ایسے وسیع اور بین الاقوامی کلچر کو تسلیم کر چکے ہیں جس کی حدیں مشرق و مغرب پر محیط ہیں تو کسی دانشور کا یہ کہنا کہ ہمارا حافظ و سعدی اور میر و غالب سے کوئی تعلق نہیں' بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آج کے بعد کے ہندوستان کے

Marfat.com

مسلمانوں سے ہم اتنے بے تعلق ہو جائیں کہ ان تخلیقات اور کلچرل مظاہر کو ہم بالکل اجنبی سمجھنے لگیں لیکن 47ء سے پہلے کی مشترک تاریخ اور تمدنی گزشت سے ہم کس طرح غیر متعلق ہو سکتے ہیں۔ جو رشتے ایک ہزار سال میں مستحکم ہوئے وہ آسانی سے منقطع نہیں ہو سکتے البتہ آئندہ کل کی بات اور ہے آپ چاہیں تو مسلمانان ہند سے بالکل بے نیاز ہو جائیں اور یہ اعلان کر دیں کہ اب ہماری ان کی برادری ختم ہے—— لیکن مجھے ڈر ہے کہ آسانی سے ہم یہ بھی نہ کر سکیں گے کیونکہ جب ہم فلپائن اور صومالیہ کے مسلمانوں سے منقطع نہیں ہو سکتے تو یہ سوال بہر حال قابل غور ہو گا کہ مسلمانان ہند کے لیے یہ عجیب و غریب استثنیٰ چہ معنی دارد؟ ان کی مجبوریوں کے پیش نظر ہماری ہمدردیاں ان کے شاملِ حال رہیں گی۔

میں الزام لگانے کا عادی نہیں ہوں لیکن ڈر یہ ہے کہ پاکستانی کلچر کی اخباری بحث محض فکری انتشار کو گہرہ اور وسیع کرنے کے لیے ہے مسلم کلچر کی اتنی واضح اور محکم اتحاد آفرین صورت واقعی کے باوجود ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اخلاقی باتوں کو ابھارنا اور ان اختلافات کو سہارا دینے کے لیے مردہ دفن شدہ بہم اور نیم شائستہ معاشرتوں کے گڑے مردے اکھاڑنا کسی خاص مذموم مقصد کے لیے تو ہو سکتا ہے ان سے ملک میں چار سیاسی قومیتیں یا آزاد مملکتیں تو پیدا ہو سکتی ہیں لیکن بار بار سوچنے کے باوجود اس قسم کی افتراق انگیز بحثوں کی اچھی حکمت اور خیر و برکت سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کوششیں تشخیص کی تلاش میں معلوم نہیں ہوتیں بلکہ تشخص کو مبہم بنانے کے لیے ہیں۔

باقی رہی اردو زبان اور علاقائی زبانوں کو اس سے متصادم کرنا—— تو ظاہر ہے کہ یہ بھی مذکورہ بالا مذموم مصلحت کے تابع ہی ہو سکتا ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ مسلم کلچر نے بنیادی زبانوں (عربی' فارسی' ترکی) کے پہلو بہ پہلو جملہ علاقائی زبانوں اور بولیوں کے ادب کو بطور عمدہ معاون قبول کرنے اور انہیں ترقی دینے میں کبھی بخل نہیں کیا۔ لہٰذا اردو اور علاقائی زبانوں میں جز اور کل کا رشتہ ہے اور اس حیثیت سے انہیں لڑانا خدمت کی کوئی اچھی مثال نہیں۔ اور ایک مشترک قومی زبان کی ضرورت تو اتنی واضح ہے کہ میں اس کے حق میں دلائل لانے کو تحصیلِ حاصل سمجھتا ہوں۔

ضمیمہ الف

مسلم کلچر میں فنون لطیفہ تعیّش یا عبادت؟

فنون لطیفہ کا مسئلہ بھی عجیب ہے۔ فطرت انسانی کے لیے ناگزیر مگر انسانی عمل میں کبھی محض تعیش اور کبھی عبادت۔ آج کل ایک اصطلاح "زندگی" استعمال ہوتی ہے مگر معنی اس کے بھی متعین نہیں' کہا جاتا ہے' فنون لطیفہ برائے زندگی ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں' مگر بہت کم لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اس برائے زندگی کے معنی کیا ہیں؟ــــــ اور یوں غور کیجئے تو کون سی چیز برائے زندگی نہیں۔ ہمارا چلنا پھرنا' کھانا پینا' شعر پڑھنا اور گنگنانا' شام کی سیر' صبح کی ورزش گول باغ میں دھوپ تاپنا' سمپوزیم میں تقریر کرنا' سینما کا تماشا دیکھنا میر تقی کا دیوان پڑھنا' ٹیلی ویژن دیکھنا' شارع قائداعظم پر اردو کا جلوس نکالنا' غرض کیا ہے جو برائے زندگی نہیں سعدی نے کہا تھا۔

ہر نفسے کہ می آید ممد حیات است = ہر ہر سانس زندگی ہے اور برائے زندگی ہے۔ ایسے میں یہ تقسیم کہ کوئی ادب یا فن برائے زندگی ہےــــــ یا برائے زندگی نہیں' بے مقصد سی بات ہے۔ تاہم جو لوگ اس اصطلاح کا بار بار استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک زندگی کے خاص معنی ہیں مثلاً ان کا خیال یہ ہے کہ زندگی سے مراد اجتماعی اور سماجی زندگی ہے جس کی بنیاد امید' عمل اور اجتماعی ترقی کی آرزو پر ہے۔ زندگی سے مراد محض جینا نہیں بلکہ جینے کا وہ انداز ہے جو انسان کی اجتماعی ترقی کا مظہر اور معاون ہے' پس اس صورت میں زندگی کے معنی مخصوص ہیںــــــ یہ معنی ایک خاص علم کلام اور ایک خاص علم الاجتماع کے تابع ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہر قسم کے اختلاف پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ترقی کے نظریے ہر قوم کے اپنے اپنے ہیںــــــ اور اس کی روشنی میں ہر قوم کا نظریہ زندگی بھی مختلف ہے۔ اور یہ اگر صحیح ہے تو ہر قوم کا تصور فن بھی مختلف ہے۔

اس معاملے میں مشرق و مغرب کے زاویہ ہائے نظر کو دیکھئے' ان میں اختلاف اتنا

Marfat.com

واضح ہے کہ ایک دوسرے کی ضد معلوم دیتا ہے۔ قدیم دور کے چینیوں اور یونانیوں کے ذوق کا فرق دیکھیے[1] چینی اپنے گھر کی دیواروں کو تصاویر سے بھر دیتے تھے۔ یونانی دیواروں کے ہر نقش کو اس حد تک مٹانے کے قائل تھے کہ بقول میر ؎

منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

مشرق بہار رنگ (Colour) دکھا کر اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے۔ مغرب آئینہ صورت (Form) میں حسن کی بہار دکھاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ صورت کی تشکیل میں ذہانت کام کرتی ہے اور اس کا منتہا معانی (Ideas) کا ابلاغ ہے' اس کا تخاطب بھی دماغ سے ہوتا ہے۔ رنگ اس کے برعکس معانی سے زیادہ جذبوں کے مبہم تاثرات کی ترجمانی کرتا ہے' مغرب رنگ میں کمزور' اور بے اثر ہے مشرق صورت میں غیر موثر اور غیر یقینی ہے۔

تہذیب کی ترقی نے اگرچہ یہ فرق کم کر دیے ہیں پھر بھی اصلی رجحان کبھی کبھی عود کر آتا ہے—' یہ واضح ہے کہ اب مشرق و مغرب کی پرانی حد بندی نہیں رہی اور صورت کی قطعی تشکیل کی جگہ تجریدی مصوری جو رنگوں اور دھبوں کے اندر صورت کو چھپا دیتی ہے' یورپ کی خاص چیز بنتی جاتی ہے' ویلنسکی نے اپنی کتاب جدید آرٹ کا تجزیہ میں لکھا ہے کہ اب آرٹ کو مشرق و مغرب کے لحاظ سے تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ اب آرٹ ایک عالمگیر حقیقت ہے' اس کی تقسیم جغرافیے کے لحاظ سے نہیں بلکہ طبائع انسانی کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔

دراصل ویلنسکی کا یہ خیال اس مفروضے پر قائم ہے کہ اب دنیا میں تہذیب صرف ایک ہے اور وہ مغرب اور امریکہ کی تہذیب ہے اور سارا عالم اس کی قلمرو میں شامل ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سمٹ کر' ایک ہو جانے کے باوجود دنیا ایک ہوئی نہیں—بلکہ ایک ہو جانے کے بعد اقوام نے کچھ پہلے سے بھی زیادہ قومی اور ملکی انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اب قومیت پر پہلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور ظاہری ہم رنگی کے باوجود رنگا رنگی بلکہ اختلاف کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا ہے۔

یہ ساری گفتگو میں یہ ثابت کرنے کے لیے کر رہا ہوں کہ بنیادی مماثلتوں کے باوجود ہر قوم کا تصور فن مختلف ہے۔ ہم پاکستان میں جن حالات میں ہیں ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ ہم نے سراپا مغربی ذہن بنالیا ہے اور ہم ذوقی لحاظ سے سراپا مغربی ہو گئے ہیں ایک غلط مفروضہ ہے۔ ہم سارے اکتساب کے باوجود مشرقی بھی ہیں اور مسلمان بھی یہ خصوصیت ہمارے شعور کے بغیر اور ہماری کوشش کے بغیر ضرور ابھر آتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے

Marfat.com

کہ اکثر اوقات ہم مغربی تصویروں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمارا ذوق کسی ایسی شے کا مطالبہ کرتا ہے جو ان تصویروں میں نہیں ہوتا۔ یہ بے اطمینانی دراصل ہمارے اس شعور اجتماعی کی وجہ سے ہوتی ہے جس میں روک اور صورت کا ایک اور تصور رچا بسا ہوا ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ ہمارے ملک میں فنون لطیفہ کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں سخت اختلاف ہے ___ اس کی کیا وجہ ہے؟ بے خیالی میں آپ کہہ دیں گے۔ یہ ملّایانہ کورذوقی کے باعث ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ذوق اور تصور فن کے مختلف زاویوں کی وجہ سے ہے ___ اور چونکہ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور اس ذوقی زوایے سے ہمدردی نہیں کی جاتی اس لیے اس کے خلاف بغاوت ہوتی ہے اور لوگ سرے سے فنون لطیفہ ہی کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ فنون لطیفہ کے سلسلے میں بغاوتوں کو فرو کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فنون لطیفہ کے بارے میں بنیادی قومی رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور فنون کی ذوقی تربیت قدرتی اصولوں پر ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں فن کی اس روایت کا ذکر بھی لازمی ہے جو مسلمانوں کے ماحول میں پیدا ہوئی۔ اس روایت کے اثرات ہمارے اجتماعی لاشعور میں موجود ہیں ___ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے سارے تہذیبی دور میں فنون لطیفہ کی آبیاری کی ہے اگرچہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کی روایت میں بعض فنون کی حوصلہ شکنی اور بعض کی کامل نفی ہے۔ یہ حوصلہ شکنی دو وجہ سے ہوئی اول اس وجہ سے کہ بعض اقوام کی طبائع' بعض خاص میلانات کو قبول اور بعض کو رد کر دیا کرتی ہیں جیسا کہ میں نے اس سے پہلے چینیوں اور یونانیوں کے سلسلے میں عرض کیا ہے' دوسری وجہ یہ کہ دین اسلام نے ہر شعبہ حیات میں' اپنے مخصوص عقائد کو نافذ کیا ہے جس کا مقصد یا تو بنیادی عقیدوں کا یا محض اپنی انفرادیت کا تحفظ تھا۔

یہ واضح ہے کہ مسلمانوں نے شبیہی یا تشبیہی فنون میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی مثلاً تعمیری اور تنظیمی فنون میں لی ہے۔ یہ ان کے عقیدہ توحید کا اثر تھا۔ وہ شبیہ نگاری کو اس عقیدے کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے مجسمہ سازی بھی نہیں کی (یعنی کوئی روایت پیدا نہیں کی اور علی العموم اس سے اجتناب کیا ہے) ڈرامے کا فن نقالی اور نقالی کا فن ہے اس لیے اس سے بھی اجتناب کیا۔

لیکن جہاں ان فنون کو نظر انداز کر دیا وہاں انہوں نے ایک طرف ہندسی اشکال' نقاشی (اور منبت کاری وغیرہ) کو اور دوسری طرف تعمیر کے فن سے خاص شغف کا ثبوت

Marfat.com

دیا۔ یہ بھی دراصل جیسا کہ اوپر بیان ہوا کچھ تو اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے تھا اور کچھ اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھانے کے لیے تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے ان سے استفادہ کرنے کے باوجود شبیہ اور مجسمے سے اجتناب کیا لیکن گاتھک اصول تعمیر کی "ہندسیت" کو اپنا لیا' مگر انفرادیت قائم رکھی۔

آج کے حضرات' اس نکتے کو اہمیت نہیں دیں گے۔ لیکن ایک مخصوص انداز حیات اور منفرد اسلوب زندگی ہمیشہ مسلمانوں کے مد نظر رہا۔ من تشبه يقوم فهو منهم آج کے دوستوں کی نظر کچھ نہیں ہے تو نہ سہی مگر مسلمانوں نے اس پر سختی سے نظر رکھی۔ مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ دنیا کے تختے پر ایک نئی قوم وجود میں آ گئی ہے۔ جس کا ہر چیز کے بارے میں اپنا خاص نقطۂ نظر ہے۔

!___ اور عامر نے جب اندلس کے کلیساؤں کو دیکھا جس پر تصویریں منقش تھیں تو کہا___ بخدا ہم ان کی نقل نہیں کریں گے___ ہم حسن کے نئے اسالیب دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ چنانچہ جب مسجد قرطبہ تعمیر ہوئی تو دنیا نے دیکھ لیا کو شبیہی مصوری کے بغیر' محض ہندسی اشکال سے تخلیق حسن ہوئی اور خوب ہوئی۔ تشبیہی رنگ و صورت نہیں بلکہ ہندسہ و اقلیدس___ تجرید کا یہ انداز تجریدی ہونے پر بھی' احساس صورت پیدا کر رہا تھا۔ تب دنیا پر منکشف ہوا کہ محض خطوط بھی' صورت کے ترجمان اور قائم مقام ہو سکتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی فنی اصطلاحوں میں تخلیق شاید موجود ہی نہیں۔ کیونکہ خلق صرف خدا کے لیے ہے۔ احسن الخالقین کے معنی یہ نہیں کہ دنیا میں اور بھی خالق موجود ہیں۔ اور خدا ان میں سب سے اچھا خالق ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو جو لوگ خالق ہونے کے مدعی ہیں ان کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ ان کی سعی یا دعویٰ خلق بے اثر اور ناقص ہے___ خلق کی صفت صرف خدا سے مخصوص ہے اور وہی صحیح معنوں میں خالق ہے۔

مسلمانوں کے ادب میں ابداع' اختراع اور خلق کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔

ابداع کے معنی ہیں پیدا کرنا اور عدم سے وجود میں لانا۔ بدیع اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے کیونکہ اس نے مخلوق کو کسی مثال اور نظیر کے بغیر جس طرح چاہا پیدا کیا۔ اسی قیاس پر فن میں ابداع سے مراد ایسی اختراع ہے جو پہلے موجود نہ ہو۔ یا اگر ہو تو پھر اس میں ایسی جدت اور اپج پیدا کر دی گئی ہو جو اسے بالکل صحیح شکل و صورت عطا کر دے۔

ایجاد کے معنی ہیں کسی شے کو وجود میں لانا۔

خلق عربوں کے کلام میں خلق سے مراد کسی چیز کو عدم سے کسی سابقہ مثال کے

Marfat.com

بغیر پیدا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ابداع کے قریب ہے' لیکن بعض اوقات اس کے معنی اس سے کچھ مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔ خلق کے معنی تقدیر بھی ہیں۔ اس کے معنی ہیں اندازہ کرنا۔ اس لحاظ سے احسن الخالقین کے معنی احسن المقدرین۔

صنعت اور صناعت کے معنی ہیں کسی علم کے مطابق کسی شے کو وجود میں لانا۔ اس لحاظ سے مسلم فن کار خالق نہیں بلکہ مخترع ہے۔ اور یہ وہی فرق ہے جو Maker اور Creator میں ہے۔ اور مسلمانوں کے فنون پر اس تصور کا بھی اثر پڑا ہے۔ مسلمان فن کار خدا کی صنعت تخلیق میں شرکت کا مدعی کبھی نہیں ہوا۔ وہ اگر مبدع بھی کہلایا تو خالق کے معنوں میں نہیں بلکہ مخترع کے معنوں میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم صناع' اپنی صنعت میں کس مقصد سے تحریک عمل حاصل کرتا تھا___ مسلمانوں کی فنی سرگرمیوں کو غائر نظر ڈالنے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا عمل زیادہ تر مساجد' مقابر اور کتاب کے گرد گھومتا ہے ان سے الگ کچھ ہے تو وہ مقصدی (Functional) ہے۔ یعنی محلات' مع باغات اور قلعے۔

مسلم فن کار ہر جگہ خدا کا جوئیدہ ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے۔ ایک مذہبی جذبے سے کرتا ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک عبادت کے مانند' الوہی اور یزدانی ہے' وہ خدا کو ایسی صورت میں منعکس دیکھنا چاہتا ہے جو متحجر ہو کر بھی لاانتہا و لامحدود نظر آئے۔ مسجدوں کے صحن وسعت کے ترجمان اور ان کے مینار لاانتہائیت Infiniteness کے اشارے ہیں۔ کتابوں کے نقش و نگار بھی لامحدودیت کے مظہر ہیں___ اسی وجہ سے وہ شاعری بھی مقبول ہوئی جس میں استعارہ مبالغہ کی حدوں سے جا ملتا ہے۔

خدا کے اوصاف لاانتہا ہیں:

قل لو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد و کلمت ربی ولو جئنا بمثله مدادا (18 الکهف تا 109) یعنی

آپ کہہ دیجیے: اگر میرے پروردگار کے کلام اوصاف لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائیں' تو سمندر ختم ہو جائیں گے پیشتر اس کے کہ میرے پروردگار کے اوصاف ختم ہوں اگرچہ ہم ایسے اور سمندر مدد کے لیے لے آئیں۔

ولو ان مافی الارض من شجرة اقلام و البحر یمده من بعده سبعة ابحر ما نفدت کلمت الله ان الله عزیز حکیم 31 (لقمٰن) 27۔ یعنی

اور اگر روئے زمین کے درخت قلمیں بن جائیں اور سارے سمندر (سیاہی) تو

Marfat.com

بھی اللہ تعالیٰ کا کلام و اوصاف ختم نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ غلبے اور حکمت کا مالک ہے۔

کلمات اللہ سے مراد اللہ کا کلام اور اوصاف ہیں (لسان العرب)

بہر حال مسلم فنکار' خدا کی جستجو میں' وسعتوں اور رفعتوں کے نقش بناتا ہے۔ اس فنکار کے فن پارے مکمل نہیں۔ آرزوئے تکمیل کا اظہار ہیں ــــ نقاش جب کتاب کی آرائش کرتا ہے تو کرتا جاتا ہے اور صفحہ ختم ہو جاتا ہے ــــ گویا ابھی بہت کچھ اور بھی باقی ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

مسلم فن کار کے فن میں ہر جگہ خدا موجود ہے! آج کا ذہن شاید اس خیال پر ہنس دے گا' لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مسلم فن نہ برائے فن تھا نہ برائے زندگی (خاص معنوں میں) بلکہ برائے خدا تھا۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای و مماتی للہ رب العلمین (6 الانعام 162) یہ فن برائے خدا جذبہ عبادت گزاری کا رہین منت تھا۔ اور اسی سے اس کو وہ ترفع نصیب ہوا جو کئی معترضوں کیلئے باعث حیرت ہے۔ لامحدود کا انکشاف محدود کے ذریعے ــــ مسلم فن کار کا نصب العین یہی تھا۔

مسلمانوں کے فنون میں تعمیر کے علاوہ' خطاطی کو بڑا قبول حاصل ہوا۔ ابوالفضل کے نزدیک خط بھی تصویر کی ایک قسم ہے۔ ابوالفضل اکبر کی زبان سے تصویر کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "صنعت[1] تصویر انسان کے لیے معرفت ایزدی کی رہنما ہے۔ تصویر' فطرت کی ترجمان یا نقل کرتی ہے' لیکن یہ فطرت کا محض اشارہ یا اجمال ہے کیونکہ یہ انسان کے بس میں نہیں کہ وہ حسن فطرت یا صنعت ایزدی کی کامل باز آفرینی کرے اور اسی بنا پر' تصویر دراصل خلاق عالم کی وسیع قدرت تخلیق کا تصور دلا کر' انسان کو خالق کے سامنے جھکنے اور خود کو عاجز تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔" ابوالفضل کا یہ خیال اس عام خیال کے برعکس ہے کہ آرٹ فطرت کی کوتاہیوں کو دور کر کے مکمل تر حسن کی تخلیق کرتا ہے۔

ابوالفضل کا تصور دراصل' اسی قدیم صوفیانہ فکر کے نیچے دبا ہوا ہے کہ ہر شے خدا کی طرف رجوع کرتی ہے' لیکن جب انسانیاتی تحریکوں نے انسان کی حقیقت پر زور دیا تو انسان کی اہمیت اور اس کے کمالات کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ خود اقبال نے کہا ہے

فطرت کو خرد کے روبرو کر
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

Marfat.com

بہر حال بات ابوالفضل کی ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک ''خط قسمے است از تصویر چہ آں شبیہہ آرائے عالم علوی و سفلی است۔'' خط کے لیے اس نے ''مرأت حسن مطلق'' اور ''آئینہ جہاں نما'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

غرض اس گفتگو سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے فنون لطیفہ میں خطاطی ایک بڑا فن ہے۔ اور محض مغربی ذوق سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ ایک جمالیاتی معجزہ ہے جس کی مغربیوں کے نزدیک زیادہ اہمیت نہ سہی، لیکن بے لاگ رائے یہ کہتی ہے کہ اس میں خط بھی ہے، دائرہ بھی ہے، قوس بھی ہے، شکل ہندی بھی ہے اور شکل نباتی بھی ــــ اس میں فکر، جذبہ اور ذوق تینوں شامل ہیں اور ان کی ترکیب، انسانی تخلیق کا اعجاز ہے۔

حسن کی بات چلی ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے نزدیک حسن کے ترکیبی عناصر کیا ہیں، مجموعاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسن کا بنیادی وصف تالیف ہے۔

تالیف کے موسیقی میں معنی اور ہیں یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اجزا کی ترکیب میں تخالف و تضاد نہیں بلکہ الفت و تالیف کے عناصر 'وحدت' پیدا کر رہے ہوں۔ پس 'وحدت' حسن کی پہلی شرط ہے اور موزونیت اور تناسب اس کی دوسری شرط ہے۔

جدید ذوقیات میں تخالف بھی حسن کی ایک صفت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ہاں بھی تخالف کی صورتیں مل جاتی ہیں، لیکن ان میں تخالف مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کا مقصود بھی تناسب اور وحدت کے تصور کو نمایاں کرنا ہے۔

ہمارے ذوقیات کی تشریح علم بدیع کی بعض اصطلاحوں سے بھی ہوتی ہے۔ صنائع لفظی میں تقابل و اضداد اور صنعت عکس اور صنعت تجنیس تخالف اور تالیف کے دو مختلف سمتوں کا پتہ دیتی ہیں ــــ لیکن غور کیا جائے تو یہاں تخالف کے اندر بھی احساس وحدت و تناسب ہی کا ابھرتا ہے۔ فن تعمیر، فن خط، فن موسیقی، فن شاعری غرض ہر فن اسلامی میں موزونیت اور تناسب کے اوصاف نمایاں ہیں ــــ اور ظاہر ہے کہ یہ بلاوجہ نہیں۔ یہ سب دراصل اس تصور کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کے ہاں حسن مطلق کے تعلق میں موجود ہے۔ قصہ کوتاہ، مسلمانوں کا تصور حسن یا تصور فن کچھ بھی ہو اس میں وحدت کے بعد دوسرا اہم عنصر لامحدودیت ہے مگر یہ یاد رہے کہ اس ''لامحدودیت'' کے باوجود، مسلم فنون بے معنی تجرید کے موجد ہیں۔ بظاہر یہ تضاد معلوم ہوتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اکثر فنون کسی اہم غرض سے وابستہ ہیں اور کوئی مادی مقصد بھی ان فنون سے وابستہ ہے۔ محض مصوری برائے تفریح ان کے مدِنظر نہیں رہتی اور جہاں یہ ہے وہاں ان کا فن نسبتاً کمزور بھی

Marfat.com

ہے، مثلاً مصوری ــــ یا فن تصویر عموماً کتابوں کی خدمت میں استعمال ہوا۔ یہاں محض نقل سے زیادہ متن کی تشریح مقصود ہے۔ شبیہی کمال دکھانا مقصود نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلم فنکار کے سامنے 'تقدیس فن یا تفریح و راحت کا وہ تصور موجود نہ تھا جس پر آج کے فن پرست اور پرانے زمانے کے بگڑے ہوئے فن پرست زور دیا کرتے تھے۔ اس فنکار کا نصب العین جمالیاتی تشکیل کے ذریعے بلند تر معانی تک پہنچنا تھا...... اور چونکہ یہ مقصد عموماً دینی اور ارفع ہوتا تھا اس لیے اس سے جو فرحت اسے حاصل ہوتی تھی وہ کچھ اس طرح کی ہوتی تھی جیسے 'مثلاً عبادت سے حاصل ہو۔

کالنگ وڈ نے جذبہ اور مقصود کے لحاظ سے 'فنون کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں اس نے فنی حظ یا راحت کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنی حظ کی پاکیزہ ترین شکل وہ ہے جو جسمانی خطوط سے دور ترین ہو۔ وہ باطن کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے وارد ہونے کے بعد 'صاحب حال جسم اور اس کے خطوط کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ ایک بالاتر حالت میں ہوتا ہے۔

ممکن ہے 'آج کا فن پرست اس حالت کو تسلیم نہ کرے 'کیونکہ وہ "تن" کو کل زندگی قرار دیتا ہے 'لیکن یہ تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ حظ (Pleasure) یا راحت کسی ایک حالت کا نام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس امر پر اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ یہ تسکین کی ایک صورت ہے۔ اس صورت کی حدیں کیا ہیں اس کا فیصلہ ناممکن ہے۔ جب قصہ یہ ہے تو حظ کی اس شکل سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے جسے اوپر کی سطور میں "بالاتر حالت" کہا گیا ہے۔

ویلنسکی نے جس کی کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس بالاتر حالت کا اقرار کیا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے فنون کو ایک مذہبی عمل بھی قرار دیا ہے ــــ اور یہ بھی کہا ہے کہ ہر سوسائٹی میں فنی تسکین کی نوعیت اپنی اپنی ہوتی ہے۔ بعض فنی انداز دوسروں کیلئے اجنبی ہوتے ہیں ــــ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو ہر سوسائٹی سے خاص ہوتے ہیں دوسرے اس سے متاثر نہیں ہوتے۔

مسلمانوں کے فنی حظ کے سرچشمے دو ہیں ــــ (1) خدا کی لگن۔ جس کے ذرائع ذکر و فکر ہیں؟ (2) مادیات کی تسخیر اور مکانی وسعتوں کا احاطہ ــــ یہ مسلم ذہن کے عین مطابق ہے۔ تسخیر کائنات کا نصب العین اس کی فطرت میں ہے اور خدا سے دل لگانا 'اس کی سب سے بڑی آرزو ہے ــــ مسلم فنکار اسی کا اظہار کرتا ہے اور اسی میں اسے حظ ملتا ہے ــــ! جہاد بھی ایک عبادت ہے اس کا مقصد بلند مقاصد زندگی کا حصول ہے۔ ایک معتدل اسلامی ذہن

Marfat.com

اس سخت کوشی میں بھی راحت محسوس کرتا ہے اور ایک لحاظ سے جذبۂ جہاد اور جذبۂ فنون باہم قریب کے جذبے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دونوں کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلم ذہن، فنی تشکیل کا مخالف نہیں بلکہ صحیح تر یہ کہ فنی تشکیل کا اسی طرح دلدادہ ہے جس طرح دنیا کی کوئی اور ترقی یافتہ قوم ہو سکتی ہے۔ فرق صرف فنی زاویہ نظر اور فنی مسرت کی نوعیت کا ہے۔ مسلمان بعض خاص فنی تشکیلات کے بطور خاص شیدائی اور بعض کے بطور خاص مخالف ہیں اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا عبادت اور ذوق جہاد ان کے لیے مسرت کے دو بڑے سرچشمے ہیں۔ ان کے فن میں بھی یہی دو محرکات پس پردہ رونما ہیں۔ وہ محض نقل یا باز آفرینی کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ باز آفرینی بھی کرتے ہیں تو کسی اہم اور ٹھوس مقصد کے تحت کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فن برائے فن نہیں فن برائے مقصد ہے۔ بلکہ زندگی اور مقصد اول ہے اور فن اس کے تابع۔ اور زندگی روحانی سلسلۂ عمل بھی ہے اور مادی بھی۔ ان کے یہاں وہ فنون جو محض پست سطح کے حیوانی ذوق کی تسکین کرتے ہیں پست فنون ہیں۔۔۔ گویا پست فنون وہ ہیں جو عبادت سے زیادہ تعیش اور ذوق جہاد و تسخیر سے زیادہ تن آسانی اور سہل پسندی کو ابھارتے ہیں۔

ویلنسکی نے لکھا ہے کہ جدید نظریۂ فن میں، فن تعمیر کو پھر بلند ترین جگہ مل رہی ہے۔ ٹھوس مجربات کے اندر سے حسین صورت کی تشکیل چونکہ رفع ضدیت کا کام کرتی ہے اس لیے تعمیر کو بڑا مشکل اور نازک فن سمجھا گیا ہے۔ اس کی تعمیری اور فنی تشکیل کے باوجود اس میں نافعیت بھی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمالیات کا یہ پرانا نظریہ اب زیر و زبر ہو رہا ہے کہ فن لطیف وہ ہے جو مادی وسائل کا کم سے کم محتاج ہو۔۔۔ اور اس کی تشکیل 'بے غرض ہو یعنی اس مقصد کا کوئی مادی نفع نہ ہو۔

یہ نظریہ صدیوں سے ہمارے دل و دماغ پر غالب ہے۔۔۔ اور اسی کے تحت ہم فن تعمیر کو فنون لطیفہ کے ادنیٰ طبقے سے متعلق سمجھتے آئے ہیں۔۔۔ مگر ذوق انسانی کی تاریخ بھی عجیب ہے۔ آج ہم پھر پلٹ کر' یہاں آگئے ہیں کہ فن تعمیر ہی سب سے مشکل اور شاید سب سے اونچا فن ہے اور معلوم ہے کہ مسلمانوں کا عمل بھی یہی بتایا ہے کہ فن تعمیر ہی مقدس ترین فن ہے۔ اسی کی ہندسیت ایک طرف تجرید کی انتہا ہے اور دوسری طرف اس کی حجریت ہے جو تجرید کی ضد ہے۔ ان دونوں اضداد کے اندر سے ایک شکل پیدا کی جاتی ہے جو انسانی ہنروری کا کمال ہے۔

اس سلسلے میں موسیقی کا تجزیہ بھی برمحل معلوم ہوتا ہے۔ شوپن ہار نے کہا تھا:

Marfat.com

جملہ فنون' موسیقی کے انداز پر ڈھلے ہیں۔ غالباً اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ تمام فنون' ایک خاص ترتیب و ترکیب کے حامل ہیں۔ ان میں آہنگ اور تالیف کی ایک خاص صورت ہوتی ہے اور موسیقی میں اس کی لطیف ترین صورتیں پائی جاتی ہیں۔

شوپن ہار نے جو کچھ کہا اس کی تردید یا تائید کا یہ محل نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موسیقی انسانی فنون میں سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ ذمے داری کا فن ہے۔ اپنی تشکیل کے لحاظ سے بھی اور اپنی تاثیر کے لحاظ سے بھی!

مسلمانوں میں موسیقی کا فن بے حد مقبول رہا ہے' لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ اختلاف بھی اسی کے بارے میں ہے ــــ غور فرمائیے کہ شاعری بھی ایک مقبول فن ہے مگر اس کے بارے میں اختلاف کم سے کم ہے' مگر موسیقی مقبول بھی ہے اور اختلافی بھی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

میرے خیال میں' اس کی وجہ اس کی شدت تاثیر ہے۔ اس کی یہی صفت اس کے حق میں گئی ہے اور یہی اس کے خلاف۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسلمانوں میں فن کی انتہا یہ ہے کہ وہ عبادت (روحانی مسرت اور بالاتر حالت) کا مؤید ہے ــــ! موسیقی میں یہ کیفیت موجود ہے۔ اسی وجہ سے اکابر صوفیہ نے موسیقی کی تائید بھی کی اور اس کو اپنے معمولات میں شامل کیا۔

اس کے باوجود' موسیقی کی مدد سے اس "بالاتر حالت" کا حصول آسان چیز نہیں' اس میں بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ موسیقی' تن کی لذات کی رفیق ہو سکتی ہے اور یہی چیز' بالاتر حالت یا خلوت دل کے لیے مانع بھی ہے۔

یہ خلوت دل کیا چیز ہے؟ اس سے مراد ایسی تنہائی ہے جو ہر مادی شائبے سے اوپر لے جا کر' الوہی فضا میں پہنچانے والی ہو۔ اگر موسیقی خلوت دل کی رہنمائی نہیں کرتی اور جسمانی شہوات کے لیے مہمیز ثابت ہوتی ہے تو یہ خود صوفیوں کے نزدیک بھی فتنہ بن سکتی ہے۔

سید نذیر نیازی راوی ہیں مولانا میر حسن سیالکوٹی سے کسی نے پوچھا: سماع حلال ہے یا حرام؟ انہوں نے جواب دیا: "حلالیوں کے لیے حلال۔ حرامیوں کے لیے حرام۔"

مقصود اس سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں' موسیقی کے بارے میں اختلاف کی بنیاد یہی فرق ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔

خلوت دل کی تائید میں خود کالنگ وڈ نے بھی لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے: جب کوئی فن

Marfat.com

"عام تفریح" بن جاتی ہے تو وہ محض تفریح رہ جاتی ہے۔اس کا فن اپنے اس بلند منصب سے گر جاتا ہے جو فنون سے مخصوص ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ موسیقی کے خلاف مسلمانوں میں جب بھی تعصب پیدا ہوا اس کا باعث یہی ہوا کہ موسیقی کو لوگ سستی تفریح اور وسیلۂ تعیش بنانے لگے۔اس میں فن کی اعلیٰ خصوصیات باقی نہ رہیں' یعنی عبادت کی بالاتر حالت ــــ یا ذوق جہاد کی تربیت کا ذریعہ ــــ یا کسی مقدس مقصد کی پیش رفت کا وسیلہ۔

آج بھی جو لوگ موسیقی کے مظاہروں کی مخالفت کرتے ہیں ــــ وہ موسیقی سے زیادہ اس کے ارزاں اور تعیّشانہ پہلوؤں کی مخالفت کرتے ہیں ــــ اقبال نے بھی جب موسیقی کے باب میں "طاؤس و رباب آخر" کا ذکر کیا تھا تو مقصد یہی تھا کہ موسیقی جب شمشیر و سناں' یعنی ذوق جہاد سے الگ ہو جاتی ہے تو پیش خیمۂ زوال ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال فن کی سطح پتلیوں کے تماشے سے بلند ہے۔اس میں عبادت کی سی روحانی کیفیت لازم ہے۔

حوالہ جات

1. یہ فارسی کا ترجمہ ہے۔

Marfat.com

ضمیمہ ''ب''

پاکستان' اسلامی زندگی کی تجربہ گاہ؟

قائداعظمؒ نے اکثر موقعوں پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم پاکستان کو اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں' لیکن جب پاکستان بن چکا تو عجیب عجیب سوال پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ تھا کہ پاکستان جس اسلامی زندگی کا مدعی ہے۔ وہ اسلامی زندگی ہے کیا؟ اس مسئلے کو مزید الجھانے کے لیے کبھی کلچر کی جدید مغالطہ انگیز اصطلاح استعمال ہوئی کبھی اسلامی کلچر کے وجود سے انکار کیا گیا۔ اور بالآخر یہ کہا گیا کہ ماضی میں اگر اس نام کی کوئی شے تھی۔ تو اب اس کے لیے ہمارے لیے کچھ معنی نہیں رہے۔ لہٰذا اسلامی زندگی ایک بے معنی لفظ ہے۔

موجودہ باب میں اس اہم سوال کا جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی زندگی کے معنی کیا ہیں؟ اور یہ بھی کہ پاکستان میں اس اسلامی زندگی کے معنی کیا ہیں؟ اور یہ بھی کہ پاکستان میں اس اسلامی زندگی کا پورا جواز ہے اور یہ نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ قومی تخصیص اور ملی انفرادیت کی ضمانت ہے۔

یہ معلوم ہے کہ ہم ہندوستان میں اس لیے نہ رہ سکے کہ کسی مخلوط ریاست میں نہ تو دین اسلام کو نافذ کیا جا سکتا تھا اور نہ شخصی اور معاشرتی سطح پر ہم اسلامی زندگی بسر کرنے کی ساری سہولتیں حاصل کر سکتے تھے۔

تحریک پاکستان کے دوران ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری معاشرت ہندوؤں سے (بلکہ کل غیر مسلم دنیا سے) جدا ہے' ہمیں خطرہ یہ نظر آتا تھا کہ اس مخلوط ریاست میں ہماری اپنی منفرد معاشرت برباد ہو جائے گی۔

ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری ایک زبان بھی ہے جو مسلمانان ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں اس کا تحفظ ممکن نہیں' لہٰذا اس کے لیے بھی الگ وطن کی ضرورت ہے۔ معاشی ناانصافیوں کا خطرہ بھی تھا مگر تحریک پاکستان

Marfat.com

میں ان عذرات کا ذکر زیادہ نہیں آیا۔ رہنما عوام کو صرف یہ یقین دلاتے رہے کہ متحدہ ہندوستان میں اسلامی زندگی کی آزادی ممکن نہ ہوگی۔ وہ کچھ دیر تک بعض سیاسی تحفظات کا بھی ذکر کرتے رہے مگر بالآخر انہوں نے آزاد پاکستان کا مطالبہ کیا تو اس لیے کہ کسی مخلوط ریاست میں سیاسی و معاشی تحفظات مل بھی جائیں تو دین اسلام کے نفاذ کی صورت کسی حال پیدا نہیں ہو سکتی ـــــ لہٰذا قوم کو بتایا گیا کہ پاکستان کا مقصد فقط دین اسلام کے عملی تجربے کے لیے ایک خطۂ ارضی کا حصول ہے جس کے بغیر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

اس قطعی' واضح اور دو ٹوک دعوے اور وعدے کے مطابق' جب الگ ملک حاصل ہو گیا اور پاکستان قائم ہو گیا تو فوراً بعد' قابض اقتدار جدید الخیال طبقے نے تاویل' تعبیر اور حجت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

بہر حال کچھ تو ان لوگوں کے جواب کے طور پر مگر زیادہ تر اسلام سے محبت رکھنے والے (اگرچہ بے خبر) حضرات کے اطمینان قلب کے لیے اسلامی زندگی کا ایک خاکہ ضروری ہے تاکہ کہیں یہ لوگ بھی تشکیک کے سیلاب میں بہہ نہ جائیں۔

جہاں تک میں اسلام کو سمجھا ہوں اور جہاں تک مسلمانوں کی معاشرتی تاریخ کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا ہے مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اسلام آج کے دور کے لیے فرسودہ یا ناقابل عمل یا تکلیف دہ یا اجنبی ہے۔

اسلام ایک سادہ' معقول' فطری اور قابل عمل نظام حیات ہے' یعنی اس میں کوئی ایسا حکم نہیں جو ایسی تکلیف میں مبتلا کرتا ہو جس کی طاقت اوسط انسان میں نہیں ہوتی ـــــ یہ سیدھا سادہ نظام معاشرت' ہر ملک ہر قوم' ہر وطن اور ہر جغرافیے کے لیے آسان ہے البتہ اس میں ایک ڈسپلن ضرور ہے ـــــ اور وہ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان قوم ایک عظیم مشن والی قوم ہے کہ جتنا مشن عظیم ہوگا اس کے لیے ڈسپلن بھی اتنا ہی اہم ہوگا۔ ہمارے مغرب زدہ لوگ اس ڈسپلن سے نفور اور اس مشن کے انکاری ہیں۔

جو لوگ اسلامی زندگی کو مشکل سمجھتے ہیں وہ دراصل مغربی تہذیب اور مغربی مصنفوں سے متاثر ہیں۔ ہر شے کو حکمائے مغرب کے اقوام کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور موجودہ مغربی امریکی طرز حیات سے اس درجہ مرعوب و مسحور ہیں کہ انہیں ہر وہ شے اجنبی معلوم ہوتی ہے جو مغرب کے طریقے کے مطابق نہ ہو۔ اسے کہتے ہیں اغیار کے غلبے کا احساس۔ اسے کہتے ہیں اپنی معاشرت کے بارے میں بے یقینی' اسے کہتے ہیں خود باختگی ـــــ اسے کہتے ہیں ذہنی فکری اور عملی غلامی' اسے کہتے ہیں خودی کی شکست' اسے کہتے ہیں روحانی

موت ـــــ جو حیات کی ضد اور زندگی کی نفی ہے۔ اور یہ موت ہمارے مغرب زدہ طبقے پر وارد ہو چکی ہے جو براہ راست نتیجہ ہے مغربی تعلیم کا جس کا پہلا سبق یہ ہے کہ ایشیا ذلیل ہے۔ ایشیا پست ہے ـــــ اور ہر وہ شے فرسودہ ہے جو ایشیا سے تعلق رکھتی ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ اسلام بھی ایشیا میں ہے۔

اب غور کیجئے تو اسلام میں زندگی عبارت ہے دین اور دنیا کی یکجائی سے اور اس یکجائی کا نصب العین ہے انسان کی خوشی اور خوشحالی۔ اس دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی۔ اب دین و دنیا دونوں کے مجتمع عمل کے لیے، جن عقائد و اعمال کی ضرورت ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، (الف) عقائد (ب) عبادات اور (ج) معاملات (جن میں معاشرت شامل ہے)۔ یہ تینوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگرچہ دنیوی امور کی کفالت و تنظیم کے لیے خارجی طور سے معاملات ہی سے زندگی کی نمود ہوتی ہے مگر معاملات صحیح عقیدوں کے بغیر صحیح اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ اور صرف صحیح عقیدے ہی اس کے لیے کافی نہیں اس کے لیے قلبی تصدیق اور رضاکارانہ روحانی آمادگی بھی لازم ہے۔ یہ آمادگی عبادتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے بہترین ضمانت یہی ہے۔ جب سے عقائد، عبادات اور معاملات کے درمیان تفریق پیدا ہوئی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ مستقل سمجھ لیا گیا ہے، ہمارا تصورِ زندگی خلل پذیر ہو گیا ہے۔

زندگی کی کل خارجی عمارت معاملات کے نظم اور ان کے توازن پر قائم ہے۔ عقائد ان کی نظم کے لیے جہت متعین کرتے ہیں اور عبادتیں اس تنظیم کو مکمل کرنے کیلئے افراد میں رضاکارانہ تعاون کا شوق ابھارتی ہیں تاکہ کسی جبر اور قانونی دباؤ کے بغیر ہی انسانی معاملات کی تنظیم، معاشرے کے لیے عالم انسانیت کے لیے خوشگوار نتائج پیدا کرنے کے قابل ہو جائے۔

اسلام میں اچھی اور نتیجہ خیز زندگی اسی ہمہ گیر اور بنیادی اصول پر قائم ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ معاملات پر تو زور دیتا ہے اور عقائد کے بارے میں بھی کچھ زیادہ کھلی مخالفت نہیں کرتا کیونکہ اس میں مخالفت یا موافقت کا پتا نہیں چل سکتا۔ مگر عبادات والے حصے سے بہت بدکتا ہے۔ اس حصے کی کھلی مخالفت تو نہیں کرتا مگر اس کے بارے میں تشکیک، اور گاہے تضحیک کی روش رکھتا ہے۔ حالانکہ معاملات کا سارا معاملہ عقیدے اور اس رضاکارانہ قلبی آمادگی پر قائم ہے جس کے بغیر معاملات میں راستی، تعاون رضاکارانہ عدل و انصاف ایثار اور قربانی اور معاشرے

Marfat.com

کے لیے جذبہ خیر پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔

ظاہر ہے کہ زندگی کا ہر معاملہ اولاً ایک اصول کا متقاضی ہوتا ہے ثانیاً اس کے لیے (ڈسپلن وذہنی اور عملی ریاضت کے تحت ایک اجتماعی رویے) کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔جو لوگ اس قسم کے ڈسپلن کے بغیر، اچھے معاشرتی طرز عمل کی توقع رکھتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

انسان فطری طور پر ماحول کا پابند ہوتا ہے اس میں کچھ رجحانات اس ماحول کے تابع ہوتے ہیں۔ مگر وہ بہت کچھ تعلیم اور ریاضت سے حاصل کرتا ہے۔ اگر زندگی میں یہ ریاضت اور ڈسپلن نہ رہے تو زندگی کی گاڑی کا کوئی پہیا بھی سلامت نہ رہے۔ تعلیم بھی ذہنی ریاضت کا ایک وسیلہ ہے اور اس کی ضرورت کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ تو پھر قلبی ریاضت اور روحانی ڈسپلن کی ضرورت سے انکار کیونکر ممکن ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے عقیدے اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ عبادتیں ان اصولوں کے لیے آمادگی پیدا کرنے والا سلسلہ ریاضت ہے اور ان دونوں سے وہ نظم وضبط پیدا ہوتا ہے جسے حسن معاملہ یا حسن معاشرت کہا جاتا ہے۔ یہ معاملات ہیں اور تینوں کے اجتماع سے اچھی زندگی بنتی ہے۔

بظاہر اس پر کسی کو کچھ اعتراض نہ ہونا چاہیے، لیکن جدید لوگ معاشرتی معاملات کے حسن کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود عبادتوں کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اب تو انہیں اپنے عقیدوں کے بارے میں بھی پریشانی ہے کیونکہ مغرب سے متبادل عقیدے برابر مل رہے ہیں جو روحانی نہیں۔ منفعتی اور مادی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ عبادتوں کے ذریعے حاصل ہونے والے ڈسپلن سے انکار کیوں ہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں۔

ایک سبب تو یہ ہے کہ اچھے عقیدوں کے باوجود بعض لوگ نہ تو عبادت کرتے ہیں اور نہ ان کا معاشرتی معاملہ درست ہے، اسی طرح ان میں سے بعض عبادت تو کرتے ہیں مگر معاملات میں ان کا کردار ناپسندیدہ دیکھا گیا ہے، اس لیے ان کی رائے میں یہ ضروری نہیں کہ عبادت انسان کو اچھا انسان بناسکے۔ اس عام تاثر کے زیر اثر لوگ عبادتوں کو معاملات کی حد تک غیر مؤثر کہنے لگے ہیں۔

بادی النظر میں اس رائے میں کچھ وزن نظر آتا ہے کہ جب عبادتیں، کردار نیکی نہیں پیدا کرتیں تو ان کا فائدہ کیا؟ لیکن غور کیجیے تو یہ صورتحال بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ عقیدے، عبادتیں اور معاملات تینوں کو ایک ساتھ چلنا چاہیے۔ ورنہ الگ الگ

Marfat.com

ان میں سے ہر ایک نیکی ہونے کے باوجود حقیقی نیکی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہاں میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیکی سے میری مراد عام ہے' اس میں خدا کی یاد بھی شامل ہے اور وہ خدمت بھی شامل ہے جو یاد خدا کا ثمر ہے۔ میرے نزدیک سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے انسان کے کسی دکھ کو دور کرنے کی کوشش کرے (بقدر طاقت) میرا یہ تصور مغربی Humanism سے متاثر نہیں جو صرف انسان پر انحصار رکھتا ہے اور خدا کو خارج کر دیتا ہے ــــ میں خدا کو محیط مانتا ہوں۔ اس کی یاد اور اس کے تعلق سے انسان' انسان کی خدمت کے قابل ہو سکتا ہے۔

بہر حال زندگی کا نتیجہ خیز اور حسین عمل (نیکی) ان تینوں کے اجتماع سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ الگ الگ ان میں ہر ایک بے اثر ہے' اگر کوئی شخص نماز روزے میں تو ٹھیک ہے مگر عقائد اور معاملات میں اس کی نہج درست نہیں یا عقائد درست ہیں اور عبادت اور معاملات میں ناقص ہے یا معاملات کو عقائد کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کرتا تو گویا اس نے سالم شے کے ٹکڑے ٹکڑے خود کر دیئے اور اس پر وہ اس امر کا بھی شاکی ہے کہ اس شے سے متعلق فوائد و برکات اسے (یا کسی کو) حاصل نہیں ہو رہے' اچھے عقیدوں کا دعویٰ کر کے' معاملات میں اچھا نہ ہونا' یہ بھی اس جزوی عمل کا نتیجہ ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

اسی طرح یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ اچھے عقائد و اصول کے بغیر بھی معاملات اچھے ہو سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی اتفاقی طور سے' کسی شخص کی فطری سعادت مندی اچھے عقیدوں اور عبادتوں کے بغیر بھی معاملات میں اسے راست روی پر قائم رکھتی ہے مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ صورت اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بعض لوگ' یورپ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مغرب میں لوگ' مذہبی عقیدوں اور عبادتوں کے بغیر بھی معاملات میں درست اور واضح ہیں اس لیے نیک عقیدوں اور عبادتوں کی ضرورت کیا ہے؟

یہ بھی غلط فہمی ہے' یہ صحیح ہے کہ یورپ کے لوگ' کل تک عقل کی مدد سے اچھے معاشرتی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر یہ دلیل بھی ہمارے موقف کی تائید کرتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے معاشرتی اخلاق کی بنیاد بھی چند اصولوں پر ہے اور یہ اصول چند عقیدوں سے ابھرے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان عقیدوں کی نہاد روحانی نہیں عقلی تمدنی اور تجرباتی ہے۔ مگر ہیں تو یہ عقیدے ہی ــــ پس معاشرتی عمل کے لیے عقائد اور تجربے (ریاضت) کی ضرورت واضح ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عقل اور اخلاقی اصولوں کے راستے خاصی دور تک مشترک ہیں۔ عقل کے مطابق تمدنی عمل کی ریاضت' خاصی حد تک عبادت کے مقصد کے

Marfat.com

قریب قریب جا پہنچتی ہے۔ یورپ کا ذکر کرتے رہنا اور معقول نہ بننا یہ نری غیر معقولیت ہے۔ مذکورۂ بالا غلط فہمی کے اندر ایک اور غلط فہمی عقل کے بارے میں ہے۔ یہ مسلم ہے کہ یورپی تہذیب عقلی تہذیب ہے (اگرچہ اب سائنسی زیادہ ہے) یہ سمجھنا کہ عقل کا اخلاق سے کچھ تعلق نہیں بڑی سطحی بات ہے عقل اور اخلاق بڑی دور تک ہم قدم رہتے ہیں۔ معقولیت دراصل شرافت اور اخلاق ہی کا ایک روپ ہے اگر ہمارے ملک میں کوئی شخص شرافت عقیدے کے راستے سے حاصل نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم وہ یہ کرے کہ خود بھی معقولیت اختیار کرے اور سوسائٹی میں بھی معقولیت کی اشاعت کرے۔

بایں ہمہ ضروری نہیں کہ عقلی تمدنی اصول نہایت مفید ہونے کے باوجود معاملات میں لازماً صحیح نہج اختیار کرے۔ پھر عقلی تمدنی اصولوں کا عمل اس لیے بھی رہتا ہے کہ اس سے نیکی کے لیے قلبی اور رضاکارانہ آمادگی پیدا نہیں ہوتی۔ عموماً عقلی اصول اسی حد تک باہمی تعاون پر ابھارتا ہے جس کی حد تک محدود ذاتی منفعت متاثر ہوتی ہو ـــــ عقل معاملات میں ڈسپلن اور ایثار کی ضرورت کو سمجھ تو سکتی ہے مگر فرد کے وجدان کا حصہ نہیں بن سکتی۔ یہ کام صرف عبادت سے ہو سکتا ہے، یعنی اس کے لیے ایمان کی ضرورت ہے۔

ہمارے لوگ بڑے زمانے تک مغرب کے اس عقلی تمدنی اصول کے گن گا گا کر، اپنے عباداتی نظام کا مضحکہ اڑاتے رہے، لیکن ایک تو خود یورپ میں محض عقلی تمدنی اصول نظر انداز ہوتا جارہا ہے اور نجی اخلاق، معاشرتی اخلاق، بین الاقوامی اخلاق اور ہمہ گیر انسانی اخلاق میں فرق یوں ہونے لگا کہ ایک شخص بازار میں تو بھلا مانس ہے مگر گھر میں پرلے درجے کا غنڈا ہے۔ یا اپنے ملک کے اندر تو شریف آدمی ہے مگر دوسری اقوام کے معاملے میں بدترین خلائق اور مکروہ حد تک چالباز ہے ـــــ اور اب تو یورپ والوں نے یہ اقرار بھی کر لیا ہے کہ انسان حیوان ہے اور حیوان ہی رہے گا ـــــ اس سے نیکی ممکن ہی نہیں ـــــ گویا اب عقل کی مدد سے شرافت کا اصول بھی گیا۔

ہم لوگ رات دن مغرب والوں کے معاشرتی اخلاق کے قصیدے پڑھنے کے باوجود، مغرب کے عقلی تمدنی اصول تک کو بھی اپنا رہنما نہیں بنا سکے۔ بددیانتی اور رشوت ستانی اور جعل سازی کو آرٹ بلکہ سائنس بنا کر ہم اتنا بھی نہ کر سکے کہ نجی اور کاروباری معاملات میں اتنی ہی شرافت پیدا کر لیتے جو عام یورپ والے عقل پسند میں ہوتی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں مغرب کا عقلی تمدنی اصول بھی یہاں زیادہ دیر چل نہیں سکا۔ قلبی انقلاب اور نیک معاملات کے لیے آمادگی کی خاطر کسی اور شے کی

Marfat.com

ضرورت ناگزیر ہے۔ اور وہ ہے عبادت ــــ ’صرف عبادت ــــ‘ یعنی وہ گداز جو نیکی بدی میں امتیاز پیدا کرے اور نیکی یعنی حسن معاملت اور ذوقِ خدمت کو بیدار کرے۔ ہم لوگ عبادت سے اس لیے گریزاں ہیں کہ اس کی وجہ سے ’اسے ایک خاص قسم کے ڈسپلن کا پابند ہونا پڑتا ہے اور اس ڈسپلن کی پہلی شرط خود کو روکنا ہے اور یہی ہمیں گوارا نہیں۔

ہم لوگ ان معاملات میں یورپ کا حوالہ دیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ اگر یورپ والا آداب اور ڈسپلن کا اتنا مخالف ہوتا تو وہ اب تک بد نظمی حیات کا شکار ہو چکا ہوتا اور جتنا ڈسپلن میں کمزور ہوتا جا رہا ہے مغربی معاشرہ بد نظمی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ میں کوئی شے اب بھی ہے جسے ہم ڈسپلن کہہ سکتے ہیں یا کوئی چاہے تو اسے احساس ذمے داری کہہ ڈالے اور یہ بھی ڈسپلن کا دوسرا نام ہے۔

زندگی کا مقصد ’ارضی قیام انسانی کو خوشگوار بنانا ہے۔ اپنے لیے بھی ’اوروں کے لیے بھی۔ یہ قلبی آمادگی اور ریاضت کے بغیر ممکن نہیں ’دیرپا خوشی ’خواہشوں کی آزادی کامل میں نہیں بلکہ ضبط نفس کے ذریعے جائز تمتع میں ہے اور یہ عبادت کے بغیر ممکن نہیں۔ حیوان اور انسان میں یہی فرق ہے۔

میں نے عبادت کے مسئلے پر کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم لوگ ’اسلامی زندگی کے اسی قلبی ڈسپلن سے بہت گھبراتے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ڈسپلن میں خوشی کے جملہ امکانات موجود ہیں۔ جب عبادت کا ذکر آتا ہے تو ہمارے معاشرے کے بعض تارک الدنیا زاہدوں کا تصور معاً سامنے آجاتا ہے ــــ اور عام خیال یہ ہونے لگتا ہے کہ اسلامی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص رات رات بھر نمازیں پڑھے ’سال سال بھر کے روزے رکھے ــــ خود کچھ نہ کمائے۔ اوروں کے دیئے پر گزر بسر کرے ’زندگی کی جدوجہد میں شرکت نہ کرے اور ہر وقت اللہ اللہ کر کے عمر گزار دے ــــ اور زندگی کی ہر لذت سے کنارہ کش رہے۔ در حقیقت یہ تصور یکطرفہ ہے ــــ یہ کسی ایک شخص کا ذاتی عمل تو ہو سکتا ہے مگر اس کیلئے کوئی اجتماعی سند موجود نہیں۔ اسلام میں زندگی ایک انعام ہے اور کائنات میں موجود ’ہر شے انسان کے لیے ہے ۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک ہمہ در کارند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

قرآن مجید میں زندگی کے انعامات سے بہرہ اندوز ہونے کی بجا بجا تلقین موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ بھی ہے کہ یہ تعلقات جائز حد کے اندر ہوں ــــ اس کے

Marfat.com

علاوہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان تعلقات میں بری طرح الجھ کر' وہ اہم فریضے آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائیں جن کی وجہ سے انسان کو دیرپا راحت ملتی ہے ـــــ اور اس کی زندگی اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بامعنی اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔

اسلامی تصور کی رو سے' ایک مسلمان کے دو بنیادی فریضے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مسلمان ہمہ وقت داعی (مشنری) ہوتا ہے' دعوت الی الخیر ایک مسلمان کا بنیادی فرض ہے۔ دنیا کی تمام مخلوق کے لیے مسلمان داعی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوسرا فریضہ ہمہ وقتی جہاد کا ہے۔ نیکیوں کو زندہ رکھنے اور بدی کے مقابلے میں ان کے تحفظ کا فریضہ دائمی اور ہمہ وقتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک مسلمان' ہمہ وقت داعی اور ہمہ وقت سپاہی ہے۔

ان دونوں اہم فریضوں کی صحیح بجا آوری کے لیے ایک بااصول اور مستعد زندگی کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ نفسانی طور سے حریص آدمی اس قسم کی زندگی کے قابل نہیں ہوتا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ عبادتوں کا مقصد رات رات بھر نماز یا سال سال بھر کے روزے نہیں بلکہ ارکان اسلام کی صحیح بجا آوری کے ذریعے بااصول اور مستعد زندگی گزارنا ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی کل نعمتوں سے فائدہ اٹھانا جو بااصول اور مستعد زندگی کے لیے ضروری ہوں۔

ہم میں سے اکثر لوگ چونکہ مغربی ذوق اختیار کر چکے ہیں اس لیے وہ داخلی اور خارجی طور سے زندگی کے تقاضوں سے بیگانہ ہو گئے ہیں ـــــ اور زندگی کے ان اسالیب پر فریفتہ ہیں جو یورپ نے ہم میں پھیلا دیے ہیں۔ اپنی گمراہی کے باعث ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اسلامی زندگی کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خوش پوشی' خوش ذوقی' باسلیقہ معاشرت' ذوق جمال اور ادراک حسن جیسی نعمتوں سے محروم کر دیے جائیں گے۔

مگر کوئی ہمیں یہ بتائے کہ گزشتہ بارہ تیرہ سو برس میں' ہماری معاشرتی تاریخ کے کسی دور میں' ان نعمتوں پر کوئی پابندی لگی ہے؟

اگر بعض مواقع پر بعض خاص بے اعتدالیوں کے خلاف ہنگامہ ہوا ہوگا تو وہ بے اعتدالیوں کے خلاف ہوا ہوگا۔

مثلاً آج بھی اگر کوئی شراب نوشی' قمار بازی' بدکاری' اسراف' فضول خرچی اور اس قسم کے دوسرے مشاغل کے خلاف آواز بلند کرے تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟

Marfat.com

بعض لوگ اسلام کے بعض معاشرتی تصورات سے خوف کھاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا تصور مرد و زن کے الگ الگ دائرے کے تعین کا ہے۔ مغرب نے انسانی سوسائٹی پر چند بڑی بڑی لعنتیں مسلط کی ہیں ان میں ایک بے محابا اختلاط مرد و زن بھی ہے۔ ہم لوگ مغرب کے اس تحفے سے بے حد خوش ہیں ___ اور اسلامی زندگی کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ مخلوط معاشرے سے ہماری دلچسپی بھی ہے۔

لیکن کوئی غور سے دیکھے تو اس پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ دلچسپی عارضی خوشی کے نتیجے میں دیرپا ناخوشی پر منتج ہوتی ہے۔

مخلوط معاشرے نے گزشتہ بیس برسوں میں ہمارے ملک میں کئی گھرانوں کو برباد کیا ہے' اس ملک کی اکثر دوسری شادیاں ان اونچے گھرانوں میں ہوئی ہیں جہاں مخلوط معاشرت موجود ہے ___ اور اگرچہ عائلی قوانین موجود ہیں مگر اونچے طبقے کے "مخلوطی" پہلی بیبیوں کے ہوتے' دھڑا دھڑ دوسری شادیاں رچاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر طلاقیں بھی اس مخلوط معاشرت کا فیضان ہے۔ ہمارے ملک کی خاندانی زندگی کی ابتری بھی اسی رسم بد کا عطیہ ہے۔

غرض یورپ کی عینک اتار کر ذرا بھی غور کیا جائے گا تو مخلوط معاشرت ہزار ہا روحانی مصائب کا سرچشمہ نظر آئے گی۔

ہمارے ملک کے لادین مسلمان خواتین کو مختلف طریقوں سے ڈرا رہے ہیں کہ اسلامی زندگی کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پھر قید میں ڈال دی جاؤ گی۔

قید میں مسلمان عورت نہ پہلے تھی نہ اب ڈالی جائے گی۔ مقصد تو صرف اتنا ہی ہے کہ مرد و زن دونوں کو ان راہوں پر نہ جانے دیا جائے جو منزلی بے اطمینانی کی طرف جاتے ہیں۔ مخلوط زندگی بے اطمینانی کا سرچشمہ ہے۔ اور اسباب ظاہر ہیں۔ ہم نے چالیس پچاس سال پہلے تک کے معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس میں حیا کی قید تو تھی باقی کوئی قید نہ تھی۔ حیا کے تحفظ کے لیے پردہ مختلف شکلوں میں موجود تھا۔ راہ چلتی خواتین جب گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھر کے واپس آتیں تو راستے میں اجنبی مرد کے نمودار ہونے پر منہ دیوار کی طرف کر لیتیں۔ بس یہی قید تھی' کھیتوں میں اپنے مردوں کے ہمراہ کام کرنا معمول ہے۔ اس میں حیا کے سوا کوئی قید نہیں۔

مقصد چونکہ حیا کا تحفظ تھا اس لیے جہاں زیادہ سخت تدابیر کی ضرورت سمجھی جاتی تھی وہ بھی کی جاتی تھیں۔ عورتیں جب دوسرے گاؤں جاتی تھیں تو ایک لمبی چادر میں خود کو چھپا لیتی تھیں۔ شہروں میں یہی کام برقعہ سے لیا گیا۔

Marfat.com

آج جو امرا پردے کی سخت مخالفت کرتے ہیں سخت پردہ انہیں کے آباؤ اجداد نے اپنی برتری کے اظہار کے لیے نافذ کیا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے' ہماری عورتیں دوسری عورتوں کی طرح باہر کیسے نکل سکتی ہیں—— یہاں تک کہ پالکیوں کے اندر پتھر رکھ دیے جاتے تھے تا کہ صحیح وزن کہاروں کو بھی معلوم نہ ہونے پائے۔

یہ شدت امرا نے پیدا کی تھی وہ اب مغرب کے غلام ہوئے تو انہوں نے پردہ شکنی میں بھی شدت اختیار کی۔ اور ان کی "بگڑی ہوئی" خواتین نے شور مچانا شروع کر دیا۔ عورتوں کو قید سے نکالو۔ عورتوں کو قید سے نکالو——!

قید سے نکالنے کے امرا کے نزدیک یہ معنی نہیں کہ عورتوں کو چلنے پھرنے اور اپنے کام کاج کرنے اور مناسب تفریح کی آزادی دو (وہ تو ہمیشہ حاصل رہی ہے) بلکہ یہ ہیں کہ عورتوں کو دوسرے مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے' نائٹ کلبوں' شراب خانوں اور قہوہ (قحبہ) خانوں میں آنے جانے کی کھلی اجازت دو—— اب تعلیم گاہوں میں ان عورتوں کی اولادیں قید سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ ہر دیوار کے سائے میں کھلم کھلا کچھ ہوتا رہتا ہے!

قید سے نکالنے کا اگر یہ مطلب ہے تو یہ تو شاید بڑا ناجائز مطالبہ ہے۔ آخر ہم مسلمان ہیں ہمارا ایک معاشرتی ضابطہ ہے جس کے اصول خود قرآن مجید میں موجود ہیں' یہ اصول ایسے ہیں جو مسلمانوں کے معاشرتی ڈسپلن کے لیے ضروری ہیں۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یہ ڈسپلن ضروری ہے۔ آخر وہ بھی کیا سوسائٹی ہے جس کے کچھ آداب نہ ہوں۔ مسلمان زندگی میں جو مشن لے کر آئے ہیں اس کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یہ آداب یہ ڈسپلن ضروری ہے۔ پردہ (قید حیا) صرف عورتوں کے لیے نہیں مردوں کے لیے بھی ہے۔

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اب ہم جس مسلمان گروہ میں چل پھر رہے ہیں وہ اس عظیم مشن ہی کا قائل نہیں—— وہ خود کو ایک بین الاقوامی معاشرہ کا فرد سمجھتا ہے—— یعنی اسے یہ یاد ہی نہ رہا کہ مسلمان ایک مخصوص منفرد غیر معمولی مشن والی قوم ہے اور اپنے آداب میں کچھ انفرادیت رکھتی ہے۔ ہم نے ایک سو سال سے' مغربی تصورات کے تحت' خاندانی نظام کی حکمت پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کہ اس نظام میں ہر فرد خاندان کا ایک مقرر منصب تھا—— ہم نے پہلے خواتین کے منصب کے بارے میں اپنے فرائض چھوڑ دیے اب اپنے بچوں سے بھی غافل ہیں۔

نتیجہ یہ کہ معاشرہ خوشی اور سکون سے محروم ہوتا جاتا ہے' عورتیں' عیسائی اساتذہ

Marfat.com

کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر' اسلام کو قید سمجھ رہی ہیں۔ اور بازار کا اشتہار بننا—— اور مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ارزاں فروخت ہونے پر فخر کرنا ان کا شیوہ ہے۔

بظاہر انہیں اس میں راحت نظر آتی ہے۔ مگر چند دن کی راحت کے بعد جو کرب اور بے چینی اور دوامی تکلیف اس طبقے کے حصے میں ہے اس سے ہر وہ کوئی باخبر ہے جسے اس طبقے کے حالات معلوم ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خواتین جس شے کو قید سمجھ رہی ہیں وہ قید نہیں—— ڈسپلن ہے۔ انہیں اس ڈسپلن کے تحت پوری آزادی حاصل ہے—— زندگی کی ہر خوشی میں وہ حصہ دار ہیں' زندگی کے ہر عمل میں' اپنی فطری صلاحیتوں کے اندر رہ کر' وہ شریک ہیں' یہی ڈسپلن مردوں کے لیے ہے مگر یہاں سمجھ لیا گیا ہے کہ ڈسپلن صرف عورتوں کے لیے ہے مرد اس سے مستثنٰی ہیں' اور حق یہ ہے کہ ڈسپلن کو توڑنے والے اولاً مرد ہی ہیں۔

فطری صلاحیتوں کا مسئلہ ذرا سی تشریح چاہتا ہے' مغرب نے یہ گمراہی پھیلا دی ہے کہ عورت ہر کام کر سکتی ہے' لیکن یہ صحیح نہیں بعض ایسے کام ہیں جو عورت کبھی نہیں کر سکتی۔ مثلاً سپاہی کا کام' بڑی ریاضت کے باوجود عورت نہیں کر سکتی اس طرح مرد عورتوں کے کاموں میں مہارت حاصل نہیں کر سکتے خواہ معمولی حد تک شد بود پیدا کر بھی لیں۔

تو کہنا یہ ہے کہ عورتوں کو ہر آزادی حاصل ہے۔ جو حیا' تحفظ عصمت اور تحفظ خاندان کے تقاضوں سے نہیں ٹکراتا۔ اسی قسم کی آزادی اور پابندی مردوں کے لیے بھی ہے۔ ہاں ان کا دائرہ کار خارج میں ہے۔ اس لیے وہ باہر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ورنہ ڈسپلن ان کے لیے بھی ہے۔ اور عورتوں کے لیے بھی۔

بے حیائی سے برہنہ نیم عریاں اور بے شرمی سے آوارہ گھومتے پھرنا—— اور آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانا اسلامی زندگی میں ممکن نہیں۔ اور اسے قید نہیں کہیں گے بلکہ آداب کا نفاذ کہا جائے گا۔

یہاں لوگ اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں' مثلاً ایک خیال یہ ہے کہ اسلامی زندگی ہر تخلیقی عمل (تخلیق فن) کی مخالفت ہے۔

یہ بہتان ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کا ہر دور اس کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ شاعری' خطاطی تعمیر' نقاشی اور دوسرے بے شمار فنون نے مسلمانوں کے زمانے میں لامثال ترقی کی۔

یہ لوگ مجسمہ سازی اور ڈراما کو سامنے رکھ کر' یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان فن کے مخالف رہے ہیں اور تفریحات سے دشمنی کرتے رہے ہیں——!

لیکن یہ محض تہمت ہے۔ مسلمانوں نے زندگی کی ہر جائز تفریح سے (جوان کے منصب جہاد اور ذوق غلبہ سے متصادم نہ تھی) تمتع کیا ہے۔

یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ فنون لطیفہ محض مجسمہ سازی یا ڈراما ہے، بعض اقوام سے مخصوص ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے فن اپنے ہیں اور اس کے عمرانی وجود ہیں۔ یہ اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا کہ یورپ والوں نے خطاطی کیوں نہیں کی؟ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یورپ میں فنون لطیفہ نہیں۔ اسی طرح کسی ایک فن کے نہ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمان فن لطیفہ کے مخالف ہیں۔

اگر کوئی شخص مغل شاہزادیوں کے شہ سواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی کی رودادیں کتابوں میں دیکھے تو اسے حیرت ہو گی ــــ مسلمانوں نے ان سب تفریحات کو ابھارا جو قوت کی مظہر تھیں، تعیش کی راہوں سے بچ کر نکلے (اگرچہ اس معاشرے میں بگڑے ہوئے لوگ پھر بھی نہ بچ سکے) مگر عام آدمی جرأت آموز کھیل کھیلتا تھا ــــ رجز سے دلوں کو گرماتا تھا ــــ اور زندگی کے سچے ڈرامے (زندہ تاریخ) سے دلچسپی رکھتا تھا۔

اسلامی زندگی اگر اب بھی آئی تو اس قسم کی ذوقیات کو ترقی دے گی ــــ ذوق زندگی، ذوق علم وانکشاف، ذوق جہاد اور ذوق تسخیر ــــ یہ چاروں ذوق اسلامی معاشرے میں فروغ پائیں گے۔ جیسے کہ وہ اسلام کے دور عروج میں پہلے بھی ترقی کر چکے ہیں۔

مجھے تو یہ صاف صاف نظر آرہا ہے۔ اور مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی دل تنگی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے ہم لوگ مغرب پر ایمان لا چکے ہیں۔ اور ایمان بھی بالغیب، ہم اپنی خودی کو بیچ چکے ہیں ــــ ہمیں مشرق و مغرب میں فرنگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ فرنگ کے اسلوب حیات کے سوا کوئی اور اسلوب بھی ہو سکتا ہے ــــ یہ ہمارے قلب و نظر کی محرومی ہے۔

بہر حال توفیق خدا کے ہاتھ میں ہے ہر کسی کو اسلامی زندگی کے بارے میں صحیح تصور پیدا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں غلطی علما کی بھی ہے کہ وہ اسلامی زندگی کا بعض اوقات ایسا تصور دیتے ہیں کہ اس سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ اور دراصل یہی لوگ ہیں جن کی مثال دے کر بعض لوگ، عام مسلمانوں میں اسلامی زندگی کے بارے میں بیزاری پھیلاتے ہیں۔ اب میں کیسے کہوں کہ علما کو بھی وقت کی آواز پر کان دھرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر، وہ دین کی سچی خدمت نہیں کر سکیں گے۔

Marfat.com

ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
وجہی سے عبدالحق تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
اشارات تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ
سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ	ڈاکٹر سید عبداللہ
اندازِ نظر	فتح محمد ملک
تحسین و تردید	فتح محمد ملک
فیض شاعری اور سیاست	فتح محمد ملک
تعصبات	فتح محمد ملک
اقبال ــ فکر و عمل	فتح محمد ملک
احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار	فتح محمد ملک
فلسطین اردو ادب میں	فتح محمد ملک
کشمیر اردو ادب میں	فتح محمد ملک
اپنی آگ کی تلاش	فتح محمد ملک
مقالات عابد (انتقاد شعری)	سید عابد علی عابد
اصول انتقاد ادبیات	سید عابد علی عابد
اسلوب	سید عابد علی عابد
البیان	سید عابد علی عابد
البدیع	سید عابد علی عابد

207.197
ع 58 ک

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1193-X
9789693511932